باتیں ہماریاں

مؤلفہ

ڈاکٹر مسز افتخار بیگم صدیقی

باتیں ہماریاں

مؤلفہ:

ڈاکٹر مسز افتخار بیگم صدیقی

والدہ کی ڈانٹ کی شکل میں بھگتنا پڑتا تھا ایک بار تو ایسا ہوا کہ انہوں نے ہمیں سگرٹ پینے کی عادت میں پھنسانا چاہا۔ ہوا یوں کہ انہیں کم عمری میں سگرٹ پینے کی عادت پڑ گئی تھی۔ جو پیسے انہیں جیب خرچ کو ملتے تھے وہ سگرٹ کے لئے ناکافی تھے۔ انہوں نے ہم سے کہا ظہیر تم بھی سگرٹ پیا کرو۔ بڑا مزہ آتا ہے منہ میں دھواں بھر کر ناک سے نکالو۔ مگر تمہیں سگرٹ کے لئے آدھے پیسے بھی دینے ہوں گے۔ ہم تیار ہو گئے۔ روزانہ دونوں کے پیسوں سے سگرٹ کی ڈبیاں آتیں۔ دو تین سگرٹیں ہمارے حصہ میں آجاتیں باقی بھائی صاحب پی لیتے۔ ابھی چند دن ہی ہمیں سگرٹ پیتے گزرے تھے کہ ایک دن والد صاحب آم کھا رہے تھے۔ ساتھ میں ہم بھائی بھی شریک تھے۔ اچانک ہمیں نہ جانے کیا سوجھی کہ ہم نے والد صاحب کو یہ اطلاع دے دی کہ بھائی صاحب سگرٹ پیتے ہیں۔ شاید اس کے پیچھے یہ جذبہ ہو کہ انکی شکایت کرنے سے وہ آم سے محروم کر دئے جائیں گے اور ان کا حصہ بھی ہمیں مل جائے گا۔ والد صاحب ابھی غصہ کرنے ہی والے تھے کہ بھائی صاحب نے کہا تم بھی تو سگرٹ پیتے ہو۔ اس کے بعد کیا ہوا ہوگا آپ خود ہی سوچ لیجئے۔ مگر نتیجہ اچھا ہی رہا۔ یعنی ہم پر ڈانٹ پڑی اور ہم آم چھوڑ کر اٹھ گئے۔ بھائی صاحب ڈانٹ بھی کھاتے رہے آم بھی۔ بعد میں جب انہوں نے ہم سے سگرٹ کے لیے پیسے مانگے تو ہم نے دینے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ہم آپ کو پیسے بالکل نہیں دیں گے آپ خود تو آم کھاتے رہے اور ہمیں ڈانٹ ڈلوادی۔ اس طرح ہم ایک غلط عادت کا شکار ہونے سے بچ گئے۔

کہا جاتا ہے کہ بچہ کی شخصیت کی تعمیر میں ابتدائی زمانہ بہت اہم ہوتا ہے۔ بچپن کی سنی ہوئی باتیں ذہن پر نقش ہو جاتی ہیں۔ وہ اپنے ماحول اور اردگرد کے لوگوں سے جو باتیں سیکھ لیتا ہے وہ زندگی بھر اس کے ساتھ رہتی ہیں۔ اور کسی بھی کتاب کے علم یا استاد کے سبق سے زیادہ فائدہ مند ہوتی ہیں۔ ہمارے بچپن میں بچوں کی اخلاقی تربیت اور ان میں حفظ مراتب کے احساس پر بہت زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ ہمدردی۔ ایثار، ادب یہ وہ

''ہم سب بحرِ عینیت میں گم ہیں۔ ہماری دعوت ''دعوت محمدی'' ہے۔ اس لیئے اس طریقہ کو ''طریقہ محمدی'' کہنا چاہئے کیونکہ ہم نے سلوک نبوی پر کوئی اضافہ نہیں کیا ہے''

مقدمہ نگار مزید لکھتے ہیں:

''ان کو عام صوفیہ کے غالیانہ افکار سے کوئی تعلق نہیں اور ان کے عقائد وہی ہیں جو تمام اہل سنت کے یہاں مسلم اور مقبول ہیں''۔

دردؔ نے ''علم الکتاب'' میں تصوف کے مسائل کی شرح کرتے ہوئے ''بہت سے کلامی مباحث اور فلسفیانہ مطالب کی عقدہ کشائی کی ہے''۔ انہیں مسائل کی بازگشت ہمیں ان کی شاعری میں بھی سنائی دیتی ہے۔ تصوف کی بہت سی اصطلاحات اعیان ثابتہ، قدیم، حادث، ممکن، فنائے عالم، حضور و شہود، شخص و عکس، اعتبار، ظہور، تنزیہہ، اضافت، وغیرہ۔ ان کے کلام میں محض رسمی طور پر استعمال نہیں ہوئیں، بلکہ ان کے دلی جذبات اور پختہ اعتقادات کے اظہار کے وسیلہ کے طور پر استعمال ہوئی ہیں۔ ان کی تعبیرات کی روشنی میں ہی درد کے کلام کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

''درد کی شخصیت'' کے ذیل میں سوانحی واقعات کا ذکر کرنے کے بجائے بعض خارجی اور داخلی عوامل کا ذکر کیا گیا ہے جن کے گہرے اثرات دردؔ کی شاعری پر مرتب ہوئے۔ ان میں ''عشق'' سب سے بڑا محرک ہے۔ درد کی شاعری میں یہ حقیقت اور مجاز دونوں مین ظاہر ہوا ہے۔ اس کا جائزہ لیا گیا ہے۔ وافر مثالوں سے دونوں کیفیات میں امتیاز قائم کر کے ان کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ ادعا بھی پیش کیا گیا ہے کہ ''انکی شاعری اور زندگی میں کامل ہم آہنگی ہے''۔ اگر چہ مجاز سے متعلق ان کے اشعار کو رسمی سے زیادہ نہیں کہا جا سکتا ہے جو اس دور کے عام مذاق کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیئے لکھے گئے ہوں گے۔

دردؔ کے ہم عصر اور دردؔ کے متاخر تذکرہ نگاروں نے ان کا ذکر بڑے ادب و احترام سے کیا ہے اور ان کی دینداری، زہد و ورع اور نیک نفسی کی ستائش کی ہے۔ ان کے اوصاف عالیہ کو گونا گوں انداز میں پیش کیا ہے۔ فاضل مقالہ نگار نے ان میں سے بعض کے اقتباسات پیش کیے ہیں اور درد کی شخصیت کی نیک سیرتی کے پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ وہ رقم طراز ہیں:

''مذکور الصدر تذکرہ نگار جو خود علمی و ادبی بصیرت میں ممتاز ہیں، اس کے معترف ہیں کہ میر دردؔ ایک مرد فاضل، درویش کامل عارف جامع شریعت و طریقت صاحب ورع و تقویٰ تہذیب و تزکیہ نفس سے آراستہ خلیق و متواضع تھے۔''

دردؔ کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے اس کو دو بڑے زمروں میں تقسیم کیا گیا ہے:

(۱) صوفیانہ اور (۲) عاشقانہ

صوفیانہ شاعری پر گفتگو کے ذیل میں تصوف کے بہت سے نظریات زیر بحث آئے ہیں۔ وحدت و کثرت، توحید وجودی اور شہودی، عینیت، عکس و وجود، تعین و لاتعین، صفات حق، ذاتی اور ایجابی صفات، قدر، خیر و شر، جبر و قدر وغیرہ۔ ان کا اظہار و استعمال جس طرح دردؔ کی شاعری میں ہوا ہے، اس پر گفتگو کی گئی ہے، شاعرانہ اور فلسفیانہ ہر دو پہلو پیش نظر رہے ہیں۔ انہیں کی روشنی میں ان مسائل کو واضح کیا گیا ہے۔ عام فہم انداز اختیار کیا گیا ہے تاکہ عام قاری بھی ان دقیق مسائل کو بقدر استعداد سمجھ سکے اور اسے درد کے اشعار کی معنوی تہوں تک رسائی حاصل کرنے میں مدد ملے۔

عاشقانہ شاعری کا جائزہ اس اعتراف کے ساتھ شروع کیا گیا ہے ''میر دردؔ کے دیوان اردو میں تقریباً نصف عشق مجازی کی طرفہ کاریوں کے لیے وقف ہے۔'' اور پھر اس شبہ کا ازالہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس نوع کی شاعری سے ان کے منصب

تصوف پر حرف آتا ہے۔ توجیہ کا محور دو نکات ہیں کہ یا تو یہ اشعار اس زمانہ کے عام مزاج و مذاق کی رعایت سے لکھے گئے یا کہیں کہیں ''ان کی معہود ذہنی ان کے شیخ کی ذات ہو''۔ شاعری کے اس رخ کو نمایاں کرنے والے بہت سے اشعار پیش کئے گئے ہیں، مگر ان میں مجاز کے باوجود شائستگی اور علویت کا پہلو غالب ہے۔ بعض دوسری خصوصیات شاعری مثلاً درد واثر، ندرت بیان، سادگی وصفائی، فنی اوصاف وغیرہ کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے۔

غرض کہ اس مقدمہ میں درد کی شاعری کے مختلف پہلو اس طرح زیر بحث آ گئے ہیں کہ ان سے درد فہمی کی بہت سی راہیں کھل جاتی ہیں۔ مدونہ متن کو قابل اعتبار قرار دیا جا سکتا ہے۔ اور اس طرح ظہیر صدیقی (مرحوم) کی یہ کاوش درد کے متنی وتنقیدی مطالعہ میں پوری طرح معاون ثابت ہو سکتی ہے۔

☆☆☆

پروفیسر معز علی بیگ،
شعبہ فلسفہ، مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ۔

''اخلاقی اقدار اور اردو ادب'' (ایک جائزہ)

اس عنوان سے پروفیسر ظہیر احمد صدیقی کی یہ گراں قدر تحریر ان کے مجموعہ مقالات ''میزان قدر'' میں ایک نہایت اہم حیثیت رکھتی ہے کیونکہ اعلیٰ انسانی اقدار تصوف اور اردو ادب کے تعلق پر جو روشنی انہوں نے ڈالی ہے اس سے یہ ظاہر ہے کہ اس تعلق کی عظمت کو اس کے تقدس سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اور یہ وہ بات ہے جس کیلئے ہمیں پروفیسر صدیقی کا احسان مند ہونا چاہئے۔

اس اہم مقالے کی ابتدا جسطرح انہوں نے کی ہے اس سے یہ بات قطعاً عیاں ہے کہ ان کی نظر اس دور میں اخلاقی اور روحانی قدروں کے انہدام کے ان ہولناک نتائج پر پڑی ہے جو واقعی آج کے دور کا المیہ ہے۔ ہمارے نزدیک چونکہ یہ باتیں تبصرے کی متقاضی ہیں اور چونکہ ان کو بیان کرنے میں ان کے ذہن کے ایک مخصوص وجدانی عمل کو دخل ہے۔ اسلئے ہم اس مضمون کی ابتدائی سطور کو یہاں پوری طرح نقل کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

''دور حاضر کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ انسان سے انسان کا رشتہ ٹوٹتا جاتا ہے۔ زندگی کی صالح قدریں بکھرتی جا رہی ہیں وہ سماج میں رہتے ہوئے بھی اپنے آپ

کو تنہا محسوس کرنے لگا ہے۔ موجودہ دور کی دوڑتی بھاگتی دنیا ایک لمحہ کیلئے بھی پیچھے کی طرف دیکھنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ سائنس اور جمہوریت دونوں زندگی کی قدروں کے احترام سے محروم ہیں۔ تہذیب کی بربادی کا ثبوت تعصب اور تنگ نظری کی صورت میں افراد اور جماعتوں میں نمایاں ہے۔ ان حالات میں اس انسان کی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے جو انسانی قدروں پر ایمان رکھتا ہے اسکو معلوم ہے کہ انسانیت کے احترام کے بغیر نہ کوئی معاشرہ پنپ سکتا ہے اور نہ کوئی ادب ترقی کی منازل طے کر سکتا ہے۔''

پروفیسر صدیقی نے یہ باتیں کہکر خود اپنے اوپر اور اپنے پڑھنے والوں پر واقعی ایک ذمہ داری ڈالدی۔ ان کی باتیں بیسویں صدی کی انسانیت کی اس آواز کی صدائے بازگشت ہیں جن کو آج کی بازاری تہذیب سننے ہی نہیں دیتی۔

یہاں پروفیسر صدیقی نے جس المیہ کا ذکر کیا ہے وہ اس صدی کے ان چوٹی کے مفکرین کا موضوع فکر و بحث ہے جنہوں نے میکانکی مادیت کے ان اثرات کے ایک ایک پہلو کو سمجھا ہے۔ انیسویں صدی میں مادہ پرستانہ فکر نے جدلیاتی مادیت کی وہ شکل اختیار کر لی جسپر اشتراکی فلسفہ معاشیات، اور سیاست کا دارومدار ہے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ علم الاقوام نے تہذیبی اضافیت کے نظریہ کو بالا دستی دیکر اور سوشل ڈارون ازم (Social Darwinism) کا سہارا لیتے ہوئے مادہ پرستانہ فکر کی ہر کمی کو دور کر دیا۔ میکانکی مادیت نے انسان کو مشین تصور کیا۔ ڈارون کے نظریہ نے انسانی عظمت کے تصور کو تقریباً دفن کر دیا، اور جدلیاتی مادیت نے انسان کے اس روحانی وجود سے انکار کر کے اسے رد کر دیا جو مذہبی تصورات پر قائم تھا۔ واقعہ تو یوں ہے کہ کلیسا کے خلاف بغاوت میں ایک ایسی شدت آ چکی تھی جس کے تحت مذہب کے ساتھ ہر اس تصور کو رد کرنا ضروری تھا جو اس سے وابستہ تھا۔ چنانچہ اسی شدت کے تحت روحانی اور اخلاقی اقدار کے تصورات کو برطرف کر دیا گیا۔ مادہ پرستانہ فکر پر فلسفہ دوئی کی گرفت بڑی سخت ہو چکی تھی۔ جسکی وجہ

سے حقیقت کے ہر پہلو سے وحدت کا تصور ختم ہو گیا۔ انسان سے انسان کا رشتہ جن وجوہ سے ٹوٹا ہے وہ ہیں تصورات میں دوئی میکانکی مادیت، تہذیبی اقدار میں نظریہ اضافیت کی بالادستی سوشل ڈارونزم اور جدلیاتی مادیت کا وہ پہلو جو انسان کے روحانی وجود سے انکار کرتا ہے۔

روحانی اور اخلاقی قدروں کے انہدام سے جو خلا پیدا ہوا ہے اسکو آج کی ایک نہایت مکروہ بازاری تہذیب نے پر کیا ہے۔ اس بازاری تہذیب کا سب سے بڑا سہارا مشینوں کی حکومت ہے۔ چنانچہ پروفیسر صدیقی نے ٹھیک ٹھیک نبض پر ہاتھ رکھا ہے وہ کہتے ہیں کہ ''عظمت انسانی کی جگہ مشینوں کے گن گائے جا رہے ہیں۔ اس تیز رفتار زندگی میں خود انسان مشین بنتا جا رہا ہے۔ عظمت انسانی احترام انسانیت۔ خود داری رواداری یہ سب الفاظ خواب پریشان بنتے جا رہے ہیں۔ آج کا المیہ یہ ہے کہ انسان کا رشتہ انسان سے ٹوٹتا جا رہا ہے''۔

اور اس کے آگے جو بات پروفیسر صدیقی کہہ رہے ہیں وہ اس صدی کا سب سے بڑا اور عالمگیر مسئلہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں ''اگر اس بکھرتی زندگی کی اخلاقی اقدار کے سہاروں سے شیرازہ بندی نہ کی گئی تو انسانیت پر سے اعتماد اٹھ جائے گا۔ ایک انسان دوسرے کیلئے اجنبی ہو جائے گا۔ جب انسان ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا تو احترام انسانیت کی بات کون کرے گا''۔

اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا
آج تک فیصلہ نفع و ضرر کر نہ سکا

آج یہ بات عالمگیر پیمانے پر ان مفکرین کیلئے لمحۂ فکریہ بنی ہوئی ہے جنکی فہرست بہت طویل ہے اور ان میں بیشتر وہ حضرات ہیں جو صف اول کے ہیں۔

اسوقت یہ سوال اٹھ کھڑے ہوئے ہیں کہ انسانیت کی شیرازہ بندی کس طرح ہو؟ اخلاقی اقدار کو کسطرح انکی روحانی بنیادوں پر استوار کیا جائے؟ انسان اور انسان کے مابین کسطرح محبت، رواداری خلوص، اعتماد ہمدردی اوران اعلیٰ ترین احساسات کو زندہ کیا جائے جنکو آج کی ٹکنالوجی، مادہ پرستانہ فکر، دوئی پسندی اور بازاری تہذیب نے ختم کر دیا ہے۔ آج یعنی ۱۹۹۷ء میں صورت حال یہ ہے کہ مفکرین کی ایک بہت بڑی تعداد اور دنیا کی متعدد انسانیت پسندانہ اور تعمیری تحریکیں صرف اسلئے اٹھ کھڑی ہیں کہ انسانیت کو موت سے بچالیا جائے اور اسکی شیرازہ بندی کچھ اس طرح کی جائے جس سے ہولناک جنگوں مظالم، اور بربریت سے انسان کو نجات مل جائے۔

موجودہ صدی میں یہ ہوا کہ ۱۹۰۱ء اور ۱۹۰۵ء میں ماکس پلینک (MaxPlank) اور آئنسٹائن کے (Einstein) کے تصورات نے اس طبیعات کا نقشہ ہی پلٹ دیا جس پر مادہ پرستانہ فکر کی بنیاد تھی۔ آج طبیعات ریاضی اور حیاتیاتی علوم میں ایک بحران ہے یہ بحران ہے جو دوئی کا خاتمہ کر رہا ہے اور حقیقت کے ہر پہلو میں وحدت کو ابھار کر سامنے لا رہا ہے۔ آج وحدت عین الیقین بنتی جا رہی ہے۔ خصوصاً ریاضی میں Chaos Theory پر جو کام ہوا ہے وہ ظاہر کر رہا ہے کہ عالم حقیقت میں ایک ایسے STRANGE ATTRACTOR کی کارفرمائی ہے جو ابتری کو ربط و نظم میں بدل دیتی ہے ۱۹۵۰ء اور ۱۹۶۰ء تک میکانکی مادیت کے اثرات نے نفسیات کو تقریباً پوری طرح اپنی گرفت میں لئے رکھا لیکن قرن حاضر کے دوسرے نصف حصہ کے اوائل سے جو فکری تبدیلیاں سامنے آئی ہیں وہ اس بات کی نشاندہی کر رہی ہیں کہ آئندہ صدی میں نفسیات کا اصلی موضوع کیا ہوگا۔ اب صورت حال یہ ہے کہ نفسیات پر بیسویں صدی کی اس طبعیات کے اثرات غالب آتے جا رہے ہیں جس میں مادہ پرستانہ فکر اور دوئی کیلئے قطعاً گنجائش نہیں ہے۔ ۱۹۸۰ء کے بعد سے خصوصاً جدید نفسیات تصوف اور ویدانت کی طرف مائل ہوتی چلی جا رہی ہے۔ دنیا کے عظیم ترین مفکرین کا خیال ہے کہ آئندہ صدی

میں انسانیت کی شیرازہ بندی وہ تاریخی عمل ہوگا جسمیں تصوف اور ویدانت کے فکر کی بالادستی نظر آرہی ہے۔ اسلامی تصوف اخلاقی اقدار کو انکی روحانی بنیادوں پر استوار کرتا ہے۔ اور وہ اس طرح اصلی حقیقی اور مصنوعی اخلاق میں امتیاز کرتا ہے۔ روحانی اخلاقیات میں اور تاجرانہ ذہنیت سے پیدا ہونے والے اخلاقی کردار میں بعد مشرقین ہے۔ ایک اصلی ہے اور دوسرا قطعاً مصنوعی اور نقلی۔

ہندوستان میں ہم کو صوفیائے کرام کے تصورات اور بھگتی تحریک کے جو اثرات نظر آتے ہیں اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان کے فکری سرمایہ سے جو قوت آئندہ صدی میں نفسیات کے انسانیت پسندانہ، وحدت پسندانہ اور روحانیت پسندانہ رجحانات کو ملنے والی ہے وہ ایک غیر معمولی قوت ہوگی جو ایک تحریک کی شکل میں شاید ان تمام تعمیری قوتوں کو ایک جگہ کردے گی جو اسوقت بکھری ہوئی حالت میں انسانیت کی شیرازہ بندی کا کام انجام دے رہی ہیں۔

ہندوستان کے اس عظیم سرمایہ پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر صدیقی نے اپنے ایک دوسرے اہم مضمون ''اردو کی سماجی اور تمدنی قدر و قیمت'' میں اس بات کو واضح کیا ہے کہ ''قرون وسطیٰ میں جب متصوفانہ فکر کے اس دھارے نے ہندوستان کی سرزمین کا رخ کیا تو اس نے ہند قدیم کے فکری سرمایہ (خصوصاً فلسفہ ویدانت) اور بھگتی تحریک کے جذباتی رجحانات کا اثر قبول کر کے ایک منفرد رنگ و آہنگ پایا۔ اور ہندوستان کی تہذیبی اور تمدنی روایات، فنون و ادب میں بیش بہا اضافہ کیا اور اس طرح اسے ہماری تہذیبی میراث میں وہ اہمیت حاصل ہوئی جسے نظر انداز کرنا ممکن نہیں۔ تصوف کی راہ سے مساوات انسانی کا تصور عام ہوا اور اردو ادب کا بنیادی تصور ہی حیات انسانی کی وحدت اور عالگیر مساوات پر مبنی رہا ہے اور یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اردو میں اس تصور کا اظہار جتنے موثر طریقے سے ہوا کسی اور زبان میں نہیں ہو سکا۔''

ہم یہاں نہایت ذمہ داری سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ پروفیسر صدیقی نے جس فکر کی ادب میں نمائندگی کی ہے اور جن روایات کا ذکر کیا ہے وہ اکیسویں صدی میں انسانیت کی شیرازہ بندی کی بنیاد کا ایک اہم حصہ ہونگی۔ مذاہب میں بیشک اختلافات ہیں اور ایک ہی مذہب میں مختلف الخیال لوگوں کی کمی نہیں اور نہ ہی مکاتیب فکر کی لیکن آج یہ حقیقت بالکل عیاں ہو چکی ہے کہ شعور کی گہری حالت میں اور ان حالتوں میں جہاں وہ قوت گیرائی پیدا کر لیتا ہے وہ تجربات تقریباً یکساں ہیں جنکو ہم عام شعوری حالات میں نہیں کر سکتے چنانچہ ایک ماورائی حقیقت کا تجربہ تقریباً ایک ہی طرح سے ہوتا ہے کیونکہ وہ حقیقت صرف ایک ہے۔

ہمیں پروفیسر صدیقی کا اسلئے احسانمند ہونا چاہئے کہ انہوں نے اپنے دراک فہم سے مستقبل قریب میں جس صورت حال کو دیکھ لیا ہے اور جسطرح تصوف کے انداز (TREND) کو اردو ادب میں ایک اہمیت کا مقام دیا ہے وہ نہ صرف ہندوستان میں قومی یکجہتی کیلیے ضروری ہے بلکہ وہ یہ بتاتا ہے کہ انسانیت کی عالمگیر شیرازہ بندی میں بھی اردو ادب کا ایک حصہ ہوگا۔ اور انسانیت کی تعمیر نو میں اسکی متصوفانہ شاعری وہ خدمت انجام دے گی جس پر مادر وطن کو فخر ہوگا۔ پروفیسر صدیقی کے وجدانی عمل نے جس بات کو اپنی گرفت میں لیا خواہ شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر وہ اسوقت تاریخ کا ایک عمل (Process of History) ہے۔ اس عمل کو اسوقت صف اول کے مفکرین بخوبی اور اچھی طرح سمجھ چکے ہیں۔

اردو ادب کی متصوفانہ شاعری میں پروفیسر صدیقی نے جن اعلیٰ انسانی قدروں کا ذکر کیا ہے وہ لازوال تقدس کی حامل ہیں۔ انکی عظمت ان کے تقدس سے وابستہ ہے آج کی معاشرتی زندگی اور انفرادی کردار میں ان کی عظمت کو گرا دینے اور ان کے تقدس کو داغدار کرنے کا انجام یہ ہے کہ انسان کا رشتہ انسان سے ٹوٹ گیا۔ اب وہ صرف

تاجرانہ، مفاد پرستانہ اور سرسری ہو کر رہ گیا ہے۔

اس ٹوٹے ہوئے رشتہ کو جوڑنے کیلئے اور انسانیت کو ''خواجہ افتراق'' کے بھیانک چنگل سے نکالنے اور انسانی مساوات کے تصور کو دوبارہ لانے کیلئے اس لازوال تقدس کو اور اس کی عظمت کو دوبارہ قائم کرنا ہوگا۔ اس کے بغیر انسانیت کی شیرازہ بندی کا اور کوئی طریقہ ایسا نہیں ہے جس پر اعتماد کیا جا سکے۔

اس کام میں اردو کی متصوفانہ شاعری بہت بڑا رول ادا کر سکتی ہے ہم تو صرف اس کے لئے ایک خوشخبری دے سکتے ہیں جو آج سے بہت مدت قبل اک ایسے صاحب نظر نے دی ہے جس پر فلک نیلی فام کا ضمیر فاش ہو چکا تھا۔ یہ وہ خوشخبری ہے جو اسوقت کے ہر ذی فہم ادیب سے کہہ رہی ہے کہ:

خرم آں کس کہ دریں گرد سوارے بیند
حو ہر نغمہ ز لرزیدن تارے بیند

☆☆☆

چیزیں تھیں جن کے بارے میں بچوں کو سبق نہیں پڑھائے جاتے تھے بلکہ اپنے گھر کے ماحول سے وہ خود ہی یہ باتیں سیکھ لیتے تھے۔ کہا جاتا تھا ''بے ادب بدنصیب باادب با نصیب''۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے تیسری یا دوسری کلاس کے ایک ساتھی (ڈاکٹر نسیم انصاری) کے گھر میں ان کے ساتھ کھیل میں مصروف تھا۔ انہوں نے بلند آواز سے کہا ''ظہیر یار ادھر تو آؤ''۔ انکی والدہ نے فوراً ٹوکا نسیم ادھر آؤ۔ ابھی تم نے کیا کہا۔ نسیم نے سر جھکا کر کہا معاف کیجئے امی غلطی سے منہ سے نکل گیا۔ ماں نے کہا اب کیا کہو گے انہوں نے کہا ظہیر بھائی۔ اسی قسم کا ایک اور واقعہ بھی مجھے یاد آ گیا۔ میرے سب سے بڑے بھائی اور بہن ایک دن آپس میں مقابلہ کر رہے تھے۔ بہن کہہ رہی تھیں کہ مجھے جو اکنی روزانہ خرچ کو ملتی ہے میں اس میں سے دو پیسے خرچ کرتی ہوں دو بچا لیتی ہوں تم سارے خرچ کر ڈالتے ہو۔ بھائی جان کہہ رہے تھے ہم بھی دو پیسے ہی خرچ کرتے ہیں۔ آپا جان نے کہا دکھاؤ۔ تب انہیں کہنا پڑا کہ وہ پیسے ہم اللہ میاں کے پاس جمع کرتے ہیں۔ ہماری کلاس میں ایک غریب بچہ ہے جس کے باپ مر گئے ہیں ہم دو پیسے اس کو دے دیتے ہیں وہ پیسے اللہ میاں کے پاس جمع ہو رہے ہیں۔

ہمارے بچپن میں آج کے سے شاندار کانونٹ اسکول نہیں ہوتے تھے۔ یا تو گورنمنٹ اسکول تھے یا پھر علیگڑھ یونیورسٹی کا ہائی اسکول تھا جو اس زمانہ کو دیکھتے ہوئے بہت ہی اعلیٰ معیار کا اسکول سمجھا جاتا تھا۔ ہماری پوری اسکولی زندگی اسی اسکول میں گزری۔ آج بھی کبھی ادھر سے گزرنا ہوتا ہے تو بے اختیار وہ زمانہ آنکھوں میں گھوم جاتا ہے جب سفید پاجامہ۔ شیروانی، ترکی ٹوپی اور بوٹ پہنے دوسرے بچوں کے ساتھ ہم بھی چھوٹا سا بستہ گلے میں ڈالے اسکول کی سرخ رنگ کی عمارت میں آتے جاتے تھے۔ گھر سے اسکول تک کا سفر پیدل ہی ہوتا تھا کیونکہ لڑکیوں کے اسکول کی لاری لڑکیوں کو تو لاتی لے جاتی تھی مگر لڑکوں کے اسکول میں ایسا کوئی انتظام نہیں تھا۔ (آج تک بھی یہی حال ہے) اور سائیکل کی سواری کرنے کی چھوٹے بچوں کو اجازت نہیں تھی۔ اسکوٹر وغیرہ کا تو

پروفیسر آفاق احمدؔ
بھوپال

ظہیر بھائی

پہلے مجھے اس بات کا بالکل احساس نہیں تھا لیکن اب ہوا ہے کہ ان لوگوں کے بارے میں کچھ لکھنا کتنا مشکل ہوتا ہے جنہیں ہم بہت زیادہ چاہتے ہیں۔ ظہیر بھائی پر کچھ لکھنے بیٹھا ہوں تو اس احساس سے شدت سے دوچار ہوں۔ کچھ یہی کیفیت اس وقت بھی ہوئی تھی جب مرحوم فضل تابش پر کچھ لکھنے بیٹھا تھا اور لکھ نہیں سکا تھا۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ظہیر صاحب کے بارے میں مجھے کچھ نہیں بہت کچھ لکھنا چاہئے۔ ان سے دوچار دس برس کی ملاقات تھوڑی تھی۔ پورے تیس سال کی دوستی تھی۔ پہلی بار کب ملے تھے۔ بہت سوچنے پر بھی یاد نہیں آتا۔ اور یاد آئے بھی کیسے۔ جب ملے ایسا لگا جیسے ایک لمبے عرصہ سے ہم ایک دوسرے کی رفاقت کا دم بھر رہے ہیں۔ بکھری یادوں کو ایک ایک کر کے جمع کرنے کی کوشش کرتا ہوں ان یادوں کو جن کے دم سے آج بھی ظہیر بھائی میرے دل کے ایک مخصوص گوشے میں اپنی جگہ بنائے موجود ہیں۔

اقبال صدی کے زمانہ کی بات ہے۔ ایم پی اردو اکاڈمی نئی نئی بنی تھی اور اس کی تقریبات کا آغاز اقبال صدی پر سیمنار اور مشاعرے کے انعقاد سے ہوا تھا۔ تین دن تک بھوپال جسے دارالاقبال بھی کہتے ہیں۔ اقبال کے رنگ میں ڈوبا رہا۔ اقبال شناسوں کی ایک کہکشاں سجی ہوئی تھی۔ مقالات ہوئے۔ مباحث ہوئے۔ جنہوں نے مقالات پڑھے

انہوں نے اور جنہوں نے نہیں پڑھے انہیوں نے بھی مباحث میں دل کھول کر حصہ لیا۔ شفیقہ فرحت، فضل تابش، یوسف کمال بخاری، اخلاق اثر، اور اقبال کے عاشق صادق ممنون حسن خاں مجھے خوب یاد ہے اس پورے مباحثہ میں جس ہستی نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا وہ ہمارے ظہیر بھائی تھے۔ انہوں نے اقبال کی نثری تخلیقات پر مقالہ بھی پڑھا تھا جس کی ستائش ڈاکٹر گیان چند نے اپنے اختتامی خطبہ میں خصوصی طور پر کی۔

اس کے بعد ظہیر صاحب بھوپال کی ادبی محفلوں کے لئے لازمی سے ہو گئے۔ صرف ادبی محفلیں نہیں بلکہ بھوپال یونیورسٹی کے بورڈ آف اسٹڈیز اور آر۔ڈی۔سی کے رکن بھی رہے۔ اقبال ادبی مرکز کا سیمینار ہونے والا ہے ظہیر صاحب آئیں گے۔ اردو اکاڈمی کا جلسہ ہو تو بھلا کیونکر ممکن ہے کہ ان کے مقالے کے بغیر مکمل ہو جائے۔ ایم۔ایل۔بی کالج میں کانفرنس ہے ظہیر بھائی کی شرکت ناگزیر ہے۔ وہ پی۔ایچ۔ڈی کے ممتحن تھے تو واٹو ا لینے بھی ضرور آئیں گے۔ اردو خواندگی پر سہ روزہ کانفرنس ہے اس کے سوا سومندوبین میں ظہیر بھائی کی اپنی شان ہے۔ گویا بھوپال ان کا گھر آنگن ہو گیا تھا اور بھوپال میں یہ مان لیا گیا تھا کہ انکے بغیر کسی ادبی و تعلیمی جلسہ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

آخری بار جب انکی علالت کا ابتدائی زمانہ تھا ظہیر بھائی ایک پی۔ایچ۔ڈی۔ کے واٹو ا کے سلسلہ میں بھوپال آئے۔ وہ زمانہ تھا جب وہ سفر کرنا ترک کر چکے تھے۔ افتخار بھابی (بیگم ظہیر) بتاتی تھیں کہ ضد تھی آفاق نے بلایا ہے ضرور جاؤں گا۔ تم ساتھ نہیں چلوگی تو اکیلا جاؤں گا۔ ان کے اصرار سے مجبور ہو کر بھابی ان کو لے کر بھوپال آئیں۔ وہ دو دن بھوپال میں رہے اور بہت خوش رہے واٹو ا لیا۔ دعوت میں شرکت کی۔ حلقۂ ارباب ادب کے جلسہ میں شرکت کی مومن خاں پر تقریر کی اور اس کا گلہ کیا کہ غالب کے دور کے دوسرے شعراء خصوصاً ذوق اور مومن پر جتنا کام ہونا چاہئے تھا نہیں ہوا اور اس کے بغیر اس دور کی ادبی سربلندی کی تصویر مکمل نہیں ہو سکتی۔ میں نے انہیں کچھ دن اور روکنا چاہا کیونکہ بھابی کہہ رہی تھیں کہ کافی عرصہ کے بعد وہ اتنے ہشاش بشاش نظر آرہے ہیں۔ مگر وہ پروگرام بدلنے پر تیار نہ ہوئے۔ یہ ظہیر بھائی کا بھوپال کا آخری سفر تھا۔

اکثر کانفرنسوں اور سیمناروں میں ظہیر بھائی کے ساتھ سفر کرنے کا اتفاق ہوا سفر میں وہ میرا اس طرح خیال رکھتے تھے جیسے کوئی بچوں کا رکھتا ہے۔ میں اکثر کہتا ہوں کہ اگر کسی کا اصلی روپ دیکھنا ہے تو اس کے ساتھ سفر کر کے دیکھو ظہیر صاحب کے ساتھ سفر کرنا کسی نعمت سے کم نہ تھا۔ مجھے حیدر آباد۔ بمبئی اور جے پور اور کئی دوسرے مقامات کے سفر اچھی طرح یاد ہیں جب ظہیر بھائی کی سنگت نے ان اسفار کو یادگار بنا دیا تھا۔ ان کی شگفتہ مزاجی۔ پر مذاق گفتگو اور ہر نئی یا بے تکی چیز کو دیکھ کر ان کا یہ جملہ کہ ''سب سائنس کے کرشمے ہیں'' آج بھی جب کوئی ایسی چیز سامنے آجاتی ہے تو میرے منہ سے بے ساختہ نکل جاتا ہے ''بقول ظہیر بھائی سب سائنس کے کرشمے ہیں''۔

سال میں ظہیر بھائی سے کم از کم آٹھ دس ملاقاتیں ضرور ہوتی تھیں دہلی میں وہ میرے میزبان ہوتے تھے۔ ویسے انکی مہمان نوازی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ بارہ مہینہ کوئی نہ کوئی مہمان انکی میزبانی کی دولت سے مالا مال ہوتا رہتا تھا۔ جب تک وہ دلّی میں رہے میں بھی انکی میزبانی سے سرفراز ہوا۔ پھر وہ علی گڑھ چلے گئے۔ میرا علی گڑھ جانا ہوا تو میں حسب معمول قدیم حکیم ظل الرحمٰن کے یہاں ٹھہرا۔ ظہیر بھائی بہت خفا ہوئے اور کہنے لگے اب میں علی گڑھ آ گیا ہوں۔ تم یہاں بھی کسی اور کے نہیں ٹھہرو گے۔ میں نے کہا میں ہمیشہ حکیم صاحب کے ٹھہرتا تھا انہیں یہ اچھا نہیں لگے گا۔ مگر ظہیر بھائی نہیں مانے اور حکیم صاحب سے اجازت لے کر مجھے اپنے یہاں لے آئے۔

ہم لوگ جب ساتھ ہوتے تھے تو دنیا جہان کی باتیں کرتے تھے۔ میں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں نے کبھی ظہیر بھائی سے کسی کی برائی نہیں سنی۔ وہ اردو والوں میں ایک منفرد اور مثالی شخصیت کے مالک تھے۔ کبھی کسی کا برا نہیں چاہا۔ ہمیشہ ہر ایک کے کام آئے۔ ایسے دردمند دل کے انسان بہت کم پیدا ہوتے ہیں۔ وہ پرانی قدروں کے پاسدار تھے۔ اگر چہ ان کے اور میرے سیاسی نظریات ایک دوسرے سے مختلف تھے لیکن ہماری دوستی کے درمیان وہ کبھی حارج نہیں ہوئے۔

مجھے یہ اعزاز بھی حاصل رہا کہ ظہیر بھائی جب بھی بھول پال آتے تھے تو انکی میزبانی کا شرف مجھے ہی ملتا تھا۔ پورے قیام کے دوران ان کا برتاؤ کچھ ایسا رہتا جیسے وہ میزبان ہوں اور میں مہمان۔ گھر میں بالکل ایسے رہتے جیسے وہ گھر کے ہی ایک فرد ہوں۔ بلقیس اور ہم ان کا انتظار کیا کرتے تھے۔

ان سے اپنی آخری ملاقات کا ایک ایک لمحہ مجھے پوری طرح یاد ہے۔ میرا قیام حسب معمول حکیم ظل الرحمٰن کے یہاں تھا۔ ظہیر بھائی سے ملنے ان کے گھر گیا۔ ان کی بیماری شدت اختیار کر چکی تھی۔ یادداشت بالکل جواب دے گئی تھی۔ بھابی نے میرے بارے میں بتایا۔ غالباً پہچان گئے کیونکہ ایک بات وہ بار بار کہہ رہے تھے۔ یہاں آپ کا ایک اور گھر بھی تو ہے۔ شاید ان کے ذہن کے کسی گوشہ میں یہ خیال ضرور موجود تھا کہ مجھے ان کے یہاں ٹھہرنا چاہئے۔ میں حیران تھا کہ اس خود فراموشی کی حالت میں بھی میزبانی کی وہ ادا برقرار ہے جو انکی شخصیت کی شناخت تھی۔ ظہیر بھائی کی یہ حالت دیکھ کر میں سکتہ میں رہ گیا۔ کافی دیر ان کے پاس ٹھہرا وہ لمحات کچھ ایسے تھے جب خاموش رہ کر بھی میں ان سے بہت کچھ کہہ رہا تھا اور وہ اپنی کھوئی ہوئی آنکھوں سے مصروف تکلم تھے۔ بالآخر رخصت کا لمحہ آ گیا۔ میرے کانوں میں بار بار ظہیر بھائی کا وہ جملہ گونج رہا تھا۔ ''یہاں آپ کا ایک گھر اور بھی تو ہے''۔ ہاں ظہیر بھائی میں نے اس گھر کو آپ کی یادوں سے منور کر کے اپنے ذہن میں آباد کر رکھا ہے۔ آپ کی شرافت نفس۔ ہمدردی۔ اعلیٰ قدروں کی پاسداری اور سب کا بھلا چاہنے کی ادا جب یاد آتی ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے آپ چپکے سے کہہ رہے ہوں۔ سب سائنس کے کرشمے ہیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر مغیث الدین فریدی
شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی۔

ظہیر احمد صدیقی (ایک مختصر خاکہ)

پروفیسر ظہیر احمد صدیقی صاحب مدینۃ العلم بدایوں کے ادب پرور خاندان کے فرد ہیں اور ان اقدار کے امین ہیں جو انھیں اپنے والد ماجد قبلہ ضیاء احمد صاحب بدایونی سے ورثہ میں ملی ہیں۔ پروفیسر ضیا احمد بدایونی (مرحوم) کا نام نامی عربی کے متبحر عالم، فارسی کے باکمال استاد، اردو کے ممتاز نقاد اور شاعر کی حیثیت سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تاریخ میں ہمیشہ روشن رہے گا۔ ظہیر صدیقی کی شخصیت حضرت ضیا بدایونی کے علم پرور اور ادب آموز سایہ میں پروان چڑھی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ماحول میں نکھری اور دہلی یونیورسٹی کے ادبی اُفق کو تابناک بنانے میں آخر تک مصروف رہے۔

ظہیر صدیقی صاحب کی وضعداری، مروّت اور انسان دوستی کا معترف ہر وہ شخص ہے جسے ظہیر صاحب کے قریب آنے اور ان کو برتنے کا موقع ملا ہے۔ ان کی قبائے ذات تکلف کے گل بوٹوں سے عاری ہے۔ ان کی شخصیت کا جوہر ان کی ادائے دلنوازی ہے۔ ایک فرض شناس استاد اور طالب علموں کے ہمدرد کی حیثیت سے انہوں نے جو سنجیدہ مگر بے تکلف ماحول پیدا کیا اس خوشگوار ماحول میں ان کے ساتھ کام کر کے ان کے ساتھیوں کو مسرت ہوتی تھی۔ میں ۱۹۶۲ء میں دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے وابستہ ہوا اور ۱۹۹۱ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوا۔ اس ۲۹ سال میں ظہیر صاحب کو ہر

نگ میں دیکھا اور ان کو ہمیشہ ظہیر صاحب ہی پایا۔ کردار کی ایسی استواری اور شخصیت کی ایسی ہمواری بزرگوں کا فیضانِ نظر بھی ہے اور مکتب کی کرامت بھی۔

وہ ادبی دنیا میں خواجہ میر درد کی دعاؤں کے ساتھ حکم مومن خاں مومن کی انگلی پکڑ کر داخل ہوئے۔ مومن کی معاملہ بندی کو ظہیر صاحب کی معصوم طبیعت سے کوئی مناسبت نہیں تھی۔ پھر بھی مومن کے مکر شاعرانہ نے ظہیر صاحب سے ڈاکٹریٹ کے مقالے کی صورت میں ''مومن شخصیت اور فن'' جیسی اہم ادبی دستاویز مرتب کرادی۔ اس سے پہلے وہ انتخاب دیوانِ مومن (۱۹۵۸) اور قصائدِ مومن (۱۹۶۱) اپنے معلومات افزا مقدمے اور تبصرے کے ساتھ پیش کر چکے تھے۔ مومن شناسی کے سلسلہ میں ظہیر صاحب نے قابل قدر تحقیقی اور تنقیدی سرمایہ فراہم کر دیا ہے۔ اس سلسلہ کی سب سے اہم کتاب ''انشائے مومن ہے۔ مومن کے فارسی خطوط کا یہ اردو ترجمہ ۱۹۷۷ء میں منظر عام پر آیا۔ مومن سے غیر معمولی شغف اور عقیدت کے باوجود ظہیر صاحب نے غالب کو نظر انداز نہیں کیا اور ''نقش ہائے رنگ رنگ'' (۱۹۷۷) کے نام سے وہ غالب کی فارسی غزلوں اور فارسی مثنویوں کے منتخب اشعار اردو ترجمہ کے ساتھ منظر عام پر لائے اس سے ان کی سخن فہمی کا سکہ تو جم گیا مگر یہ ادبی کاوش انہیں غالب کا طرفدار نہ بنا سکی۔

ظہیر صاحب کی فعال شخصیت قابل رشک تھی۔ وہ اپنے فرائض منصبی بھی ادا کرتے رہے۔ مختلف علمی، ادبی انجمنوں کے سرگرم کارکن بھی رہے۔ مختلف یونیورسٹیوں میں توسیعی خطبات دیتے رہے۔ ادبی کانفرنسوں اور علمی مذاکروں میں شرکت کرتے رہے۔ مگر اپنا مطالعہ جاری رکھا اور جب فرصت ملتی تو اس مطالعے کا حاصل کسی ادبی مقالے یا مختصر تنقیدی مضمون کے پیکر میں ڈھل جاتا۔ یہی مضامین اور مقالات ترتیب اور تدوین کے مرحلہ سے گزرنے کے بعد مطالعہ انیس مطالعہ حالی، فانی کی شاعری، فکری زاویے، احساس و ادراک، جدید شاعری اور میزانِ قدر کی صورت میں منظر عام پر آتے رہے اور ظہیر صاحب کے ذوق ادب اور زورِ قلم کا اعتبار بڑھاتے رہے۔ جدید شاعری پر اتر پردیش اردو اکادمی نے پانچ ہزار روپیہ کا انعام دیا۔

ظہیر صاحب کے مزاج میں جو تحمل اور رواداری تھی اس کا ایک دلچسپ مظاہرہ شعبۂ اردو میں ایسا ہوا جو لطیفہ بن کر بہت دن تک احباب کی محفل میں گونجتا رہا۔ شعبۂ اردو مین اردو ٹائپسٹ کی حیثیت سے جو بزرگوار تشریف لائے انہیں ٹائپ کے کام کے علاوہ شعبہ کی ڈاک کا کام بھی سپرد کیا گیا تھا۔ ظہیر صاحب کی صدارت کے زمانے میں کسی یونیورسٹی سے ایک پی ایچ ڈی کا مقالہ رجسٹرڈ پارسل کی شکل میں ظہیر صاحب کے نام شعبۂ اردو کے پتے پر آیا۔ قاضی صاحب نے اسے وصول کیا اور کہیں رکھ کر بھول گئے۔ کچھ عرصہ کے بعد اس مقالے کی رپورٹ ظہیر صاحب سے مانگی گئی ظہیر صاحب نے قاضی صاحب سے استفسار کیا تو قاضی صاحب نے بڑی معصومیت سے جواب دیا کہ اگر کوئی رجسٹرڈ پارسل آیا ہوگا تو میں نے آپ کو دے دیا ہوگا۔ ظہیر صاحب اس بے تکے جواب کو پی گئے۔ یونیورسٹی نے مقالے کی دوسری کاپی بھیج کر رپورٹ حاصل کر لی۔ مسئلہ تو ختم ہو گیا مگر بات ابھی ختم نہیں ہوئی۔ تقریباً ایک سال گزرنے کے بعد جب شعبۂ اردو کے کمروں کی قسمت جاگی اور یونیورسٹی نے کچھ مزدور صفائی اور سفیدی کے لئے بھیجے تو قاضی صاحب کے کمرے سے ایک گرد آلود ضخیم پارسل برآمد ہوا اس کو جب گرد سے پاک کر کے دیکھا گیا تو وہی مقالہ تھا جو سال ڈیڑھ سال پہلے قاضی صاحب نے وصول کیا تھا اور کسی کونے میں رکھ کے بھول گئے تھے۔ قاضی صاحب سے جب باز پرس کی گئی تو وہ برہم ہو گئے اور بولے میرا کام صرف ڈاک وصول کرنا ہے۔ آپ نے اسے میری میز پر سے نہیں اٹھایا یہ آپ کی غلطی ہے میری ذمہ داری نہیں ہے۔ ہم سب ان کی اس جسارتِ بے جا پر دنگ تھے مگر ظہیر صاحب نے قاضی صاحب کی بزرگی اور سادہ لوحی کا پاس کیا اور ان سے کچھ نہیں کہا۔ ظہیر صاحب کی جگہ کوئی اور صدر شعبہ ہوتا تو یقیناً چراغ پا ہو جاتا۔ مگر ظہیر صاحب نے جبین صدارت پر کوئی شکن نہیں آنے دی۔

ظہیر صاحب کی دلچسپ شخصیت میں ایک شاعرانہ کمزوری بھی نظر آئی اور وہ تھی ان کی بیاض - یادش بخیر ایک زمانہ تھا کہ جب ظہیر صاحب گھر سے باہر نکلتے تھے تو جیب میں اپنی بیاض ضرور رکھ لیتے تھے کہ نہ جانے کب اور کہاں شعر سنانے کی نوبت

آجائے تو حافظہ پر بے جا زور نہ دینا پڑے۔ ایک مرتبہ ہم لوگ (پروفیسر محمد حسن، ڈاکٹر شریف احمد، پروفیسر صدیق الرحمان قدوائی، ظہیر صاحب اور راقم الحروف) کریم ہوٹل میں کھانا کھانے گئے وہاں ڈاکٹر محمد حسن صاحب نے ہم سب سے پوچھا کیا اس وقت بھی ظہیر صاحب کی جیب میں بیاض ہوگی۔ میں نے کہا اس وقت بیاض کا کیا کام، ہم لوگ کھانا کھانے آئے ہیں مشاعرہ پڑھنے نہیں آئے ہیں۔ قدوائی صاحب بولے شرط ہو جائے میں نے اور شریف صاحب نے شرط منظور کرلی۔ کریم ہوٹل سے نکل کے ہم لوگ چائے پینے کے لئے فلورا میں داخل ہوگئے۔ وہاں محمد حسن صاحب نے ظہیر صاحب سے پوچھا واقعی آپ کی جیب میں بیاض نہیں ہے ظہیر صاحب مسکرائے اور مجھ سے اور شریف صاحب سے آنکھ ملائے بغیر جیب سے بیاض نکال کر میز پر رکھدی۔ میں نے اور شریف صاحب نے ایک دوسرے کو حسرت بھری نظر سے دیکھا اور محمد حسن صاحب اور قدوائی صاحب کی ظہیر شناسی پر ایمان لے آئے۔ یہ تو خیر لطیفہ تھا۔ ظہیر صاحب کی غیر معمولی علمی اور ادبی مصروفیت نے ان کی شعری صلاحیت کو اُبھرنے کا موقع نہیں دیا ورنہ جب تک انہوں نے دل لگا کر شعر کہے تو ان کی چند بہت اچھی غزلیں علی گڑھ اور دہلی کے ادبی حلقوں میں کافی مقبول ہوئیں مگر شاعری کا صنم سجدۂ مشترک کا روادار نہیں ہوتا اور دہلی کی مصروف اور تیز رفتار زندگی میں تصورِ جاناں کی فرصت کہاں۔ لہذا انہوں نے یہ کہہ کر اپنی بیاض الماری میں بند کردی۔

تم اپنی نثر کو لو نظم کو چھوڑو ظہیر احمد

صدر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کی حیثیت سے انہوں نے اپنے فرائض پوری ذمہ داری کے ساتھ انجام دیئے۔ ان کی فرض شناسی اور کارکردگی کا ایک عجیب وغریب واقعہ یہ ہے کہ یونیورسٹی کنووکیشن کی تاریخ قریب آرہی تھی اور ایک پی ایچ ڈی کے اسکالر کا زبانی امتحان باقی تھا۔ ان کے ممتحن بے حد مصروف تھے اور تاریخ کا تعین نہیں کر سکے تھے۔ اسکالر کی مایوسی کے ساتھ ظہیر صاحب کی الجھن بڑھ رہی تھی۔ جب کنووکیشن میں صرف دو دن باقی رہ گئے تو ظہیر صاحب نے جرأت رندانہ سے کام لیا۔ پہلے تو وہ یونیور

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

سٹی کے رجسٹرار سے ملے۔ ان کو صورت حال سے آگاہ کیا اور انہیں یہ بھی بتایا کہ پی ایچ ڈی کا یہ اسکالر یونیورسٹی کے ایک ممتاز کالج میں اردو کا استاد بھی ہے۔ رجسٹرار نے ان کی ہمدردی کے جذبہ سے متاثر ہو کر یہ وعدہ کر لیا کہ اگر کنووکیشن کے دن بارہ بجے تک زبانی امتحان کی رپورٹ انہیں مل جائے تو وہ اس اسکالر کو کنووکیشن میں شرکت کی اجازت دے دیں گے۔ ڈگری تیار ہو جائے گی۔ رجسٹرار کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد ظہیر صاحب نے ایک شخص کو علی گڑھ بھیجا جو ممتحن صاحب کا عزیز شاگرد تھا۔ وہ شام کی گاڑی سے گیا اور دوسرے دن صبح ممتحن صاحب کو لے کر دہلی آ گیا۔ ۱۱ بجے تک زبانی امتحان ہو گیا۔ کنووکیشن کے بعد اس امیدوار کی حیرت کا عالم دیدنی تھا جسے انتہائی مایوسی کے بعد پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی تھی۔ سچی ہمدردی اور بے لوث خدمت کے ایسے کتنے واقعات ہیں جنہیں بیان کرنے کے لئے دفتر چاہئے۔

فروزاں ہے سینے میں شمع نفس مگر تاب گفتار کہتی ہے بس

☆☆☆

تصور بھی بڑی بات تھی اسکول پہنچ کر پہلی منزل تک جانے کے لئے ایک لوہے کا گول زینہ تھا۔ بیچ کی ایک دو سیڑھیاں ذرا ڈھیلی ہونے کی وجہ سے اس پر پیر رکھنے میں بڑی زور کی آواز ہوتی تھی۔ ہم بچے اس پر بار بار اترتے چڑھتے اور ان سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر باجا بجانے کی مشق کرتے۔ اب بھی ایسا ہوا کہ ایک بار کسی کام سے اسکول جانا ہوا تو ان سیڑھیوں پر قدم رک گئے اور لاشعوری طور پر پیر سیڑھی پر مارتا رہا پھر خود ہی اپنی حرکت پر ہنسی آ گئی۔ ساتھ ہی اپنی بزرگی پر افسوس ہوتا رہا۔

اسکول کی یاد کے ساتھ بعض استادوں کی بھی یاد آ جاتی ہے۔ اگرچہ ہمارے زمانہ میں اسکول میں بچوں کی پٹائی ممنوع نہیں تھی بلکہ بچہ کو یہ کہہ کر استاد کے سپرد کیا جاتا تھا کہ ''کھال آپ کی ہے ہڈیاں ہماری ہیں'' مراد یہ کہ آپ کو اتنا مارنے کا حق ہے کہ اس کی چمڑی ادھڑ جائے مگر اتنا خیال رکھیں کہ ہڈی ٹوٹنے کی نوبت نہ آئے۔ بعض استاد اس اختیار کا استعمال بھی کرتے تھے۔ مگر ہمارے بیش تر استاد ایسے تھے جو والدین کی طرح شفقت اور محبت سے پیش آتے تھے۔ جنہیں اپنے شاگردوں کی تعلیم ہی نہیں تربیت کا بھی پورا خیال رہتا تھا۔ جو کبھی ''تنبیہ الغافلین'' کا استعمال نہیں کرتے تھے مگر پھر بھی ان کی کلاس میں کوئی ہنگامہ یا بدنظمی نہیں ہوتی تھی۔ ان استادوں میں سب سے گہرا نقش جس استاد کا ہے وہ سید محمد ٹونکی تھے۔ وہ ہمارے استاد بھی تھے، بزرگ بھی اور دوست بھی۔ انہوں نے کبھی ہمیں یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ ہماری معلومات محدود یا ہمارا مقام کم ہے۔ وہ ہمیشہ شاگردوں کے سوالات اور مسائل کا جواب بڑی دلجمعی سے دیتے اور ان کی ہمت افزائی کرتے۔ انکے اس طرز عمل نے ہمارے اندر خود اعتمادی پیدا کی۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہمارے بچپن میں تفریح کے ذرائع بہت کم تھے۔ اسکول ہماری تعلیم گاہ بھی تھا اور تربیت گاہ و تفریح گاہ بھی۔ اسکول کے ڈبیٹس، شعر و شاعری کے مقابلے۔ بیت بازی۔ میچ اور اسی طرح کے دوسرے مشاغل ہماری دلچسپی کا سامان بھی تھے اور اپنی صلاحیتوں کے اظہار کا ذریعہ بھی۔ آج کے بچوں کی طرح ہماری معلومات

سید ضمیر حسن دہلوی
ذاکر حسین کالج، دہلی

پروفیسر ظہیر احمد صدیقی

پروفیسر ظہیر احمد صدیقی دہلی یونیورسٹی کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے تو احباب نے الوداعیہ دیا۔ ماشاءاللہ وہ چاق چوبند تھے، مرنجاں ومرنج محفل کو زعزانِ زار بنا دیتے۔ چہکتے ہوئے اگن، مستعد فعال، چالیس پینتالیس سال کی ادبی خدمات نے ان کے ذوق و شوق میں اضافہ کیا تھا۔ تھکن کے آثار مطلق نہیں تھے ایسا لگتا تھا ابھی اور مہمات سر کریں گے۔ علیگڑھ میں مستقل قیام کا ارادہ تھا شریکِ حیات کو قبل از وقت ریٹائر ہونے پر آمادہ کیا اور ہم سب کو خیر باد کہتے خوشی خوشی علیگڑھ سدھار گئے۔ دلی سے چلے جانے پر بھی ان سے دہلی نہ چھوٹ سکی۔ ادبی سرگرمیوں میں آئے دن یہاں آکر شرکت کرتے رہے۔ غالب اکاڈمی کے مستقل نگراں تھے۔ مہینے میں ایک دو بار ان سے کہیں نہ کہیں ملاقات ہو ہی جاتی تھی۔ لوگوں نے کہا بھی کہ اب آرام کریں مگر وہ کام کے رسیا برابر سرگرم ہی رہے۔ دور دراز کے سفر یوں کرتے رہے جیسے نواحی قصبات میں جانا ہے۔ غالب کی طرح انہیں بھی سیاحت کا بے پناہ شوق تھا۔ ہندوستان کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں وہ نہ گئے ہوں سادھو سنتوں کی طرح بوریا بستر تیار رہتا تھا۔ ہم جیسے تساہل پسند لوگ دیکھتے تو رشک کرتے تھے۔ گھر والے بھی ان کی سفر زدگی، پرتشویش کا اظہار کرتے مگر وہ اللہ کے بندے کسی کی نہ سنتے تھے مسلسل گھومتے رہتے تھے۔ ایک چکر ہے میرے پاؤں میں زنجیر نہیں۔

کچھ عرصہ عافیت کا گزرا تھا کہ بیمار ہو گئے۔ نقاہت زور پکڑنے لگی۔ دیکھتے دیکھتے پھول سا بدن سوکھ کر کانٹا ہو گیا۔ ڈاکٹر حکیم سب کو دکھا لیا مرض کا پتہ نہیں لگتا تھا۔ طبیعت کی شادابی بھی کسی حد تک کم ہو گئی اسی دوران ایک مرتبہ غریب خانے پر تشریف لائے تو خاموش بیٹھے ٹکر ٹکر دیکھتے رہے۔ منہ سے کچھ نہ بولے اللہ اللہ وہ شخص جو اوروں کو ہنساتا تھا یوں پتھر کی طرح خاموش ہو جائے یہ دیکھنے والوں کے لئے ایک زبردست لمحہ تھا۔ معلوم ہوا کہ انہیں الزائمر کا موذی مرض لاحق ہے۔ نسیاں غالب آتا چلا گیا۔ سب کچھ بھولنے لگے۔ شاگردوں میں سے کوئی عیادت کو جاتا تو کبھی پہچان لیتے کبھی حسرت سے منہ تکا کرتے تھے۔ آہستہ آہستہ جسم ڈھلتا گیا۔ بھول بڑھتی گئی۔ زندگی سے بے نیاز ہو گئے آخر وہ گھڑی آ گئی جو ہر زندہ انسان کے لئے ناگزیر ہے۔ صدیقی صاحب نے پیغام اجل پر لبیک کہا اور چند روز صاحب فراش ہو کر جان عزیز جان آفریں کے سپرد کر دی۔

دلّی یونیورسٹی کا شعبۂ اردو تقسیم وطن کے بعد دلّی کالج کے بطن سے پیدا ہوا۔ خواجہ احمد فاروقی اس کے پہلے نگراں مقرر کئے گئے۔ ان کی انتظامی صلاحیات ظہور میں آئیں تو شعبہ صرف ملکی سطح پر ہی نہیں بین الاقوامی سطح پر بھی روشناس ہوا۔ ہندوستان کے گوشے گوشے سے طالب علم، ناقد، محققین اور اساتذہ کھنچ کھنچ کر یہاں آنے لگے۔ بڑی بڑی یونیورسٹیوں کے بڑے شعبے اس آفتاب تازہ کے آگے ماند پڑ گئے۔ علماء، اور دانشوروں نے خواجہ صاحب کی ذہانت، نظامت اور دیدہ وری کا لوہا مان لیا۔ متعدد مراعات کے ساتھ طلباء کی ایک پود لگائی گئی۔ جو لوگ اعلیٰ تعلیم کی صعوبتوں کو برداشت کرنے میں دشواری محسوس کر رہے تھے انہیں مرزا محمود بیگ پرنسپل دہلی کالج اور خواجہ احمد فاروقی کی شفقتوں نے سنبھالا، ۔۔ علم و ادب کا یہ کارواں بڑی آن بان کے ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ ظہیر احمد صدیقی اسی دور عروج میں دلی کی اقلیم سخن پر وارد ہوئے آدھے دن کے لئے دلی کالج اور آدھے دن کے لئے سینٹ اسٹیفنس کالج میں مدرس کے فرائض انجام دینے لگے۔ ابتدائی دن کافی مشقت بھرے گزرے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اردو دانوں کو اپنے آگے پیچھے ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا دکھائی دیتا تھا نہ پڑھنے والے تھے نہ پڑھانے والے۔ مستقل ملازمت کی گنجائش کم تھی۔ برسوں کی برسات میں کوئی آسامی نکلتی تو اس پر

یادگار زمانہ بڈھے ٹھیرے قبضہ کر لیتے تھے۔ نوجوانوں کی کہیں پرسش نہیں تھی۔ ظہیر صاحب ان دنوں نوجوان تھے اس لئے کچھ عرصہ تک ڈونڈاتے ڈونڈاتے پھرا کئے۔ آخر کار دلی کالج میں باقاعدہ تقرر ہوا۔ اس ادارے سے وابستگی نے ان کے لئے دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں تقرری کا راستہ ہموار کیا چنانچہ ۱۹۶۱ء میں ریڈر ہو کر وہاں چلے گئے دلی کالج کے شعبۂ اردو میں یہ ناچیز ان کا جانشین قرار پایا۔

خواجہ صاحب کی لگائی پود بڑی ہوئی تو شعبۂ کا مزید پھیلاؤ ہوا۔ ایم۔ اے کی کلاس میں طالب علم آنے لگے شبینہ کالج میں پنجاب کے آئے ہوئے پڑھے لکھے مہاجروں کی اچھی خاصی تعداد جمع ہو گئی غرض یہ کہ دکھ بھرے دن بیت گئے اور نئی فصل کاٹنے کا زمانہ آ گیا۔ بین الاقوامی رشتوں نے سیاسی نظریات کی حمایت کا راستہ دکھایا کہیں اشتراکی نظریات پنپنے لگے کہیں سرمایہ دارانہ نظام کے سائے میں آشیانہ بنایا جانے لگا۔ ایک کی باگ ڈور ڈاکٹر قمر رئیس نے سنبھالی اور دوسری کی قیادت خواجہ صاحب کے شاگرد رشید ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے حصے میں آئی۔ خواجہ صاحب نے جس سماجیاتی مطالعہ کا دبستان قائم کیا تھا اس کی دو شاخیں ہو گئیں۔ دونوں کی جڑیں اپنے اپنے سواد اعظم کی طرف بڑھنے لگیں۔ قول و قرار، وعدے وعید ہوئے اور اردو زبان کی یہ ادبی درس گاہ اپنی روایتی حدود سے نکل کر وسیع تر میدان عمل میں داخل ہو گئی۔

خواجہ احمد فاروقی محض ایک ادیب، نقاد، محقق، صاحب طرز نثر نگار اور دانشور ہی نہیں تھے جاگیر دارانہ نظام کی قابل قدر روایتوں کے امین بھی تھے۔ ان کے زمانے میں درباری آداب، حفظ مراتب اور بزرگوں کے قاعدوں قرینوں کا پورا پورا خیال رکھا جاتا تھا۔ کسی کی مجال نہیں تھی کہ صف بندی کے ضابطوں کو توڑ کر آگے نکل جائے۔ خواجہ صاحب بیرونی سفر کے دوران لمبی چھٹی پر جاتے تو ظہیر احمد صدیقی ان کی نیابت کے فرائض انجام دیتے تھے۔ بقیہ جماعت ان کے اقتدا پر اکتفا کرتی تھی۔ رفتہ رفتہ امام کو لقمے دئے جانے لگے۔ پھر اچھی خاصی اتھل پتھل ہو گئی۔ ضابطے ٹوٹنے لگے اور دیکھتے دیکھتے سارا نظام درہم برہم ہو گیا۔ خواجہ صاحب نے وہ بھی دن دیکھے تھے جب ان کے اشارہ چشم کے بغیر پرندہ پر نہیں مارتا تھا اور وہ بھی دن دیکھے جب افراد شعبہ ٹوٹے ہوئے کھنڈر میں ابابیلوں کی طرح

اندھا دھند اڑنے لگے کوئی اس محراب میں جا بیٹھا تو کوئی اس طاق میں ٹک گیا۔ خواجہ صاحب اپنے ہلتے ہوئے تخت طاؤس کو سنبھالتے رہے اور ظہیر صاحب مضبوطی سے اس کا پایہ پکڑے رہے۔ اجتماعیت ریزہ ریزہ ہوگئی۔ مجلسی آداب کا شیرازہ بکھرنے لگا۔ شعبہ کے اساتذہ نے الگ الگ کئی جہتیں اختیار کرلیں۔ بادی النظر میں سب کچھ ٹھیک دکھائی دیتا تھا مگر اندرون خانہ انتشار تھا خواجہ صاحب بڑی زمانہ سازی اور حکمتِ عملی سے توازن قائم کئے رہے مغل حکمران اورنگ زیب کی طرح اقتدار کی کرسی کو لڑھکنے نہیں دیا مگر جب خواجہ صاحب کے جوتوں میں ظہیر صاحب کے پیر گئے تو یہ جوتے کاٹنے لگے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے خاموش بغاوت ہوگئی۔ انتشار کے اس دور میں ظہیر احمد صدیقی جیسا سیدھا سادہ آدمی بھلا کر بھی کیا سکتا تھا۔ وہ بڑی حلیمی اور سعادت مندی کے ساتھ شعبہ کی کرسی اقتدار پر بیٹھے ترک سلطنت کے درویش بادشاہ ناصر الدین کی طرح یہ تماشہ دیکھتے رہے۔

ظہیر صاحب ایک شریف آدمی تھے یہی ان کی کمزوری تھی اور قوت کا سرچشمہ بھی۔ انہوں نے خالص مشرقی ماحول میں پرورش پائی تھی۔ سیاست کے ہتھکنڈے استعمال کرنا انہیں مطلق نہیں آتا تھا۔ اسی لئے ملازمت کے دوران انہوں نے چھلانگیں نہیں لگائیں لمبی زقندیں بھرنے کے بجائے پوندیوں چلتے رہے یونیورسٹی کے قوانین کے مطابق پروفیسر ہو کر ریٹائر ہوئے۔ علمی کام کرنے کے مواقع ضرور ملے توفیق بھی حاصل ہوئی۔ اور متعدد تصانیف ان کے نام نامی سے وابستہ ہیں: ان تصانیف میں انہوں نے دیدہ ریزی کا مظاہرہ تو البتہ کیا ہے لیکن دیدہ وری کا وہ معیار نہیں پیش کر سکے جو اس زمانے کی تنقید کا چلن بن گیا تھا۔ وہ ادب کو ادب کے میزان پر جانچنے کے قائل تھے۔ داخلی اور خارجی محاسن خوب پہچانتے تھے اور معائب پر گرفت کرنا بھی جانتے تھے لیکن مروت کے تقاضوں کے تحت عیب بینی نہیں کرتے تھے۔ خوبیوں اور کمالات کا سلسلہ دنیا کے معیاری ادب سے مطابقت پیدا کرنے کے لئے زمین آسمان کے قلابے نہیں ملاتے تھے اسی لئے ان کے تنقیدی نظریات میں توازن اعتدال طالب علم کی سنجیدگی اور میانہ روی پائی جاتی ہے۔ یہی بزرگوں کے مزاج کا خاصہ اور کلاسکی تنقید کا ضابطہ بھی تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کاروباری دور کی ہماہمی میں اس نقطۂ نظر کی قدر شناسی کم ہوگئی تھی۔

ظہیر احمد صدیقی نے اپنے آبائی وطن بدایوں سے رومانیت، متصوفانہ مزاج جمالیات کا تنزیہی رجحان اور وسیع القلبی کا ورثہ پایا تھا۔ علیگڑھ سے دانشوری، تربیت نفس، علم دوستی، حق گوئی اور مجلسی زندگی کے آداب حاصل کئے تھے، دلّی سے رواداری، دریا دلی، زبان و بیان کے نادر اور بیش بہا نکات، تہذیبی ارتفاع، بول چال کا دل پسند آہنگ، گفتگو کی روانی اور جان محفل بن جانے کا سلیقہ سیکھا تھا اس اعتبار سے ان کی شخصیت بہ یک وقت تین بڑی تہذیبوں کا سنگم تھی۔ یوں دیکھنے میں آپ مذکورہ بالا صفات میں سے ایک کا بھی پتہ نہیں لگا پاتے تھے کیونکہ انہوں نے جس ماحول میں پرورش پائی تھی وہاں اپنی ڈفلی بجانے کا رواج نہیں تھا۔ ہنرمند لوگ یوں ڈھکے چھپے رہے تھے کہ ہماشما کی نظر ان کی خوبیوں تک پہنچنے ہی نہ پاتی تھی۔ ولی راوولی می شناسد۔ اسپر طرہ یہ کہ وہ بڑے منکسر المزاج آدمی تھے کبھی کسی کو متاثر کرنے کی باضابطہ کوشش نہیں کرتے تھے۔ بحث مباحثہ، سمپوزیم اور سیمینار میں حصہ ضرور لیتے تھے، سامعین کی اگلی صف میں آپ ہمیشہ انہیں براجمان دیکھتے تھے مگر ذاکر صاحب کی طرح وہ بھی زیادہ سننے اور کم بولنے میں یقین رکھتے تھے جب بولنے پر آتے تو بغیر کسی رورعایت کے جو سچ ہوتا وہی کہتے تھے سچ کے سوا کچھ نہیں کہتے تھے۔ عام طور پر قاعدہ یہ ہے کہ ہم ہندوستانی اور خاص طور سے ادبی نقاد محفل میں سچ کی کڑواہٹ پر مصلحت کی مٹھاس چڑھا کر پیش کرتے ہیں:

باغباں بھی خوش رہے راضی رہے صیاد بھی

ظہیر صاحب مصالحت کے لئے تو یقیناً تیار رہتے تھے لیکن مصلحت اندیشی کے اعتبار سے ہمیشہ کمزور پڑتے تھے اس لئے ان کی آمد پر نظریاتی مخالفت کے جھنڈے تلے جمع ہونے والے گردہ میں میدان پانی پت کی طرح ہلچل مچ جاتی تھی مباحثوں کے رخ پلٹ جاتے تھے اور وہ لوگ جو کسی خاص تبلیغ کا بیڑا اٹھا کر آتے تھے سر پر پیر رکھ کر بھاگتے تھے۔ ان کی تنقید کا انداز خالص طالب علمانہ ہوتا تھا۔ نہ کوئی اینچ پینچ، نہ مرعوب کرنے والی موٹی موٹی اصطلاحات، نہ فلسفہ کی حاشیہ آرائی نہ اساوری خیالات کی جدول طرازی، بس وہی دہقان کی کھیت والی بات، نرم اور متوازن لہجہ، استواری اور ثابت قدمی پر اصرار، خود ستائی کی طمطراق سے پاک، متن کی مناسب اور موزوں مثالیں اشعار اور عبارت کے

برجستہ حوالے اور ان سب سے استنباط کرتے ہوئے نتائج یہی وجہ ہے کہ ان کے کہے کی تردید کرنا دوسروں کے لئے ذرا مشکل ہوتا تھا اور وہ آڑے ترچھے جملوں سے فضا ہموار کرنے میں لگ جاتے تھے۔

ادب کے متعلق ظہیر احمد صدیقی کے بنائے ہوئے پیمانے زمانہ قدیم کے تھے۔ ان کی شخصیت میں حالات کے تحت طوفان انگیز انقلابات رونما نہیں ہوتے تھے اپنے والد ضیاء احمد بدایونی سے انہوں نے ادبی قدروں کا ایک گراں قدر سرمایہ ورثہ میں پایا تھا۔ موصوف اردو اور فارسی ادبیات کے ایک دقیق نظر نباض تھے۔ انہوں نے اس وقت شعر و ادب کے سرمائے کا جائزہ لیا تھا جب ہماری تنقید مختلف سیاسی اور سماجی دبستانوں سے اس حد تک وابستہ نہیں ہوئی تھی کہ ہر تخلیق کو کسی خاص زاویہ نظر سے دیکھا جانا ضروری ہو۔

لفظی، صوتی اور فنی خوبیوں کے پیش نظر ادبی محاسن پر محاکمہ کرنا نقاد کا منصب خیال کیا جاتا تھا۔ چنانچہ ضیاء صاحب نے بھی ایسا ہی کیا۔ مومن کے کلام کی خوبیاں ان بزرگوں کے وسیلے سے ہم تک پہنچیں ورنہ غالب کی بھاری بھرکم شخصیت کے آگے ان کے اکثر معاصرین کو گھن لگ گیا تھا۔ ظہیر صاحب بھی مومن کی مداحی میں دوسری پشت کا حق ادا کرتے رہے غالب کی عظمت سے انکار کئے بغیر وہ مومن کے کلام کی خوبیوں کو یوں اجاگر کرتے ہیں کہ سننے والا ان کی رائے سے متفق ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

مدت سے نام سنتے تھے مومنؔ کا بارے آج
دیکھا بھی ہم نے اس شعراء کے امام کو

فانیؔ بھی ظہیر صاحب کے پسندیدہ شاعر ہیں۔ ترقی پسندوں نے ان بے چاروں پر یاسیت اور قنوطیت کا الزام لگا کر انہیں طاق پر بیٹھا دیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ لفظی تراکیب اور بیان کی برجستگی کے اعتبار سے فانیؔ کا مقام اپنے معاصرین کے مقابلے میں کہیں زیادہ بلند ہے۔ زندگی کے متعلق شاعر کے تجربات تلخ ہوں یا شیریں ان پر کسی قسم کا قدغن لگانے کا حق کسی کو نہیں ہے کلام کی قدر و قیمت متعین کرنے کے لئے ضروری ہے کہ شاعر نے ان

تجربات کو ہم تک پہنچانے کے لئے جو طریقہ استعمال کیا ہے وہ کتنا اثر آفریں ہے فانی کے کلام کی سحر انگیزی سے کون کافر انکار کرسکتا ہے ان کی غزلیں ایک زمانے میں گلی گلی گائی جاتی تھیں اور انہوں نے نہ جانے کتنے گھر گھالے تھے۔ آج بھی فانی کو پڑھیئے تو زندگی کی محرومیوں کے وہ المناک پہلو سامنے آتے ہیں جن پر عام آدمی کی نظر نہیں جاتی لہٰذا لاش، تابوت، جنازے کی ماتمی فضا کے باوجود فانی کا کلام پڑھنے اور سمجھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

غم کے ٹھوکے کچھ ہوں بلا سے آکے جگا تو جاتے ہیں
ہم ہیں مگر وہ نیند کے ماتے جاگتے ہی سو جاتے ہیں

ظہیر احمد صدیقی سے میری ملاقات اس وقت ہوئی جب میں بی۔ اے۔ کا طالب علم تھا۔ وہ ہماری اردو کلاس لیتے تھے۔ جوانی میں کچھ یوں بھی باغیانہ خیالات کا غلبہ ہوتا ہے اور کچھ ہم شرارت کے تئیں اگلی نسل سے کلاس میں الجھنے کا شوق رکھتے تھے۔ مقدمہ شعر و شاعری والی تنقید سے بوڑھے حالی کے خیالات ہماری ذہنی تشفی کے لئے ناکافی تھے۔ ظہیر صاحب ہمیں جو نصاب پڑھا رہے تھے اس میں جدید اصلاحی ادب کے اقتباسات تھے لہٰذا خوب جھڑپیں ہوتی تھیں۔ لکھنؤ کا بدنام ادب، ضبط شدہ مثنویاں، بے باک نثری افسانے معاملہ بندی، ریختی سب ان دنوں ہمیں ازبر تھے۔ تھوڑے سے انگریزی ادب کے مطالعہ نے آزاد خیالی بھی پیدا کی تھی بے راہ روی سے ربط اور ضابطہ بندی سے نفور تھا۔ ظہیر صاحب چوطرفہ حملوں سے گھبرا جاتے تھے۔ گفتنی۔ ناگفتنی سب زیر بحث آتا مگر واہ رے تحمل اور ثبات قدم ظہیر صاحب اپنی بات بے تکان کہے جاتے تھے حالی سرسید شبلی آزاد وغیرہ کے خیالات سے ایک انچ ادھر ادھر نہ سرکتے تھے۔ جھوٹ اور سچ کے رزم نامے والی کیفیت تھی۔ ہم طرح طرح کی پینترے بازی سے کام لیتے تھے اور وہ بس اپنی بات یقین کے لہجے میں دہرائے جاتے تھے۔ عمر کے اعتبار سے وہ بھی ان دنوں جوان ہی تھے مگر اللہ رے استقامت ٹس سے مس نہ ہوتے تھے ظاہر ہے یہ بات سنجیدہ مطالعہ اور غور و فکر کے ذریعہ آئی ہوگی جس میں ان کے اساتذہ اور بزرگوں کی رہنمائی کو بھی دخل ہوگا۔

اسے میں ظہیر صاحب کے لئے سب سے بڑی سعادت خیال کرتا ہوں کہ مستقل ملازمت کے لئے انہوں نے ولی کالج کا انتخاب کیا۔ ولی کالج نہ صرف یہ کہ ولی کا دل ہے بلکہ ہندوستان کے تعلیمی اداروں میں علیگڑھ یونیورسٹی کے بعد یہ دوسری اہم درس گاہ ہے۔ مرزا محمود بیگ نے اپنے زمانے میں اسے جو چار چاند لگائے وہ مستزاد ہے۔ ظہیر احمد صدیقی کو اسی چھتنار درخت کے سائے میں پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ خواجہ احمد فاروقی، مولانا عبدالطیف اعزازی منظور حسین موسوی، جاوید دششٹ شنکر صاحب اور سید حسن مہدی جیسے رفقائے کار کے ہمراہ چل کر زندگی کی وہ منزلیں طے کیں جن میں آدمی بہت کچھ اکتساب کرتا ہے ان کی شخصیت میں ان برگزیدہ حضرات کی ذات کے نقوش تلاش کئے جا سکتے تھے۔ وہ ایک ملنسار وضعدار، خوش کلام، خوش عقیدہ، مشفق مہربان اور دیدہ ور انسان تھے جس سے ملتے دل کھول کر ملتے تھے۔ ریاکاری زمانہ سازی بے جا تکلف، عجب ونخوت انہیں چھو کر بھی نہیں گزرے تھے۔ وہ ایک سادہ لوح انسان تھے اسی لئے منصب اقتدار پر رہتے ہوئے انہوں نے ذاتی منفعت حاصل نہ کی۔ دلی میں فقط روزی کمانے آئے۔ چالیس سال کے قریب ملازمت کی اور صرف بیٹ بھرا نہ کچھ جائداد خرید سکے نہ ملازمت کے بعد کسی کرسی اعزاز پر قبضہ کیا یونیورسٹی کے مکان میں رہ کر ظہیر صاحب اور انکی بیوی دونوں نے زندگی کے بہترین دن گزارے اور بوڑھے ہو کر علیگڑھ لوٹے جہاں ان کے خاندان کے متعدد افراد رہا کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ ان میں سے اکثر راہی ملک عدم ہوئے تو ظہیر صاحب کو بھی ان کا ساتھ نبھانے کے لئے دنیا چھوڑنی پڑی۔ وہ سفر کے شائق تو تھے ہی اس لئے یہ لمبا سفر بھی انہوں نے چند گھڑیوں میں طے کر لیا۔

رہِ مرگ سے کیوں ڈراتے ہیں لوگ
بہت اس طرف کو تو جاتے ہیں لوگ

☆☆☆

ڈاکٹر محمد فیروز دہلوی،
ذاکر حسین کالج، دہلی

خواجہ میر درد کی شاعری کا ایک پہلو
اور
پروفیسر ظہیر احمد صدیقی

پروفیسر ظہیر احمد صدیقی ہمارے عہد کے ممتاز نقاد اور اہل قلم ہیں۔ ان کی شخصیت بڑی ہمہ جہت اور ہمہ گیر ہے۔ ان کی تحریریں گزشتہ چار دہوں پر پھیلی ہوئی ہیں۔ پھر موضوعات کا تنوع اور بوقلمونی بڑی حیرت ناک ہے ادب اور ادب سے جڑے ہوئے نئے علوم جیسے نفسیات اور جمالیات وغیرہ نثری ادب اور شعری ادب اور ان سے متعلق بیشتر اصناف ان کے دائرہ مطالعہ میں سب شامل ہیں۔

ظہیر صاحب کو عموماً نقاد مومنؔ کی حیثیت سے جانا جاتا ہے لیکن دردؔ کی شاعری اور شخصیت کو بھی ظہیر صاحب کی دیدہ وری نے خوب جانچا پرکھا ہے۔ مومنؔ ہوں یا دردؔ دونوں پر ہمارے اعلا درجے کے نقادوں نے خوب خوب لکھا ہے سو ظہیر صاحب نے بھی لکھا ہے۔ اور اب لکھے ہوئے بھی کافی دن بیت گئے۔

دردؔ کی شخصیت اور شاعری سے متعلق نئی آرا آچکی ہیں اور آرہی ہیں۔ ادبی مورخین کے علاوہ ہمارے چوٹی کے نقادوں نے درد کی شاعری کی قدر و منزلت متعین کرنے

کی کوشش کی ہے۔ سید عبداللہ مجنون گورکھپوری سے لے کر کلیم الدین احمد خلیل الرحمن اعظمی رشید حسن خاں وحید اختر اور شمس الرحمن فاروقی تک لیکن ظہیر صاحب نے درد کی فنکارانہ شخصیت کے متعلق خود درد کی سنجیدہ نثری تحریروں کی روشنی میں جو نتائج اخذ کئے تھے ان کی سچائی اور کھرا پن ہنوز باقی ہے۔ ظاہر ہے کہ ظہیر صاحب نے بھی شاعر کی پوری شخصیت کا احاطہ نہیں کیا ہے انھوں نے شاعر کی شخصیت کے صرف ایک رخ یا پہلو کی نقاب کشائی کی ہے لیکن اس پہلو کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ آنے والی سطور میں اس مسئلہ کے اجمال کی تفصیل بیان کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

ظہیر صاحب نے نصابی ضرورت کے تحت دیوان درد شائع کیا۔ ۱۹۶۹ میں جب وہ یہ دیوان مرتب کر رہے تھے اس وقت تک دیوان درد کا کوئی ایسا نسخہ موجود نہ تھا جو جدید متن نگاری کے اصول پر مرتب ہوا ہو رشید حسن خاں صاحب کا مرتب کیا ہوا دیوان درد بہت بعد میں شائع ہوا۔ اس لئے ضرورت اس بات کی تھی کہ دیوان درد کا ایک نسخہ شائع کیا جائے جو جدید متن نگاری کے اصول پر مرتب ہوا ہو۔ اس وقت کئی قلمی اور مطبوعہ نسخے موجود تھے لیکن ان کے متن میں اختلاف تھا۔ کہیں شعر زائد تھے کہیں مصرعے بدلے ہوئے تھے۔ کہیں کتابت اور طباعت کی خامیوں کے باعث شعر کچھ سے کچھ ہو گیا تھا۔ جب اس قدر رطب و یابس ہو تو پھر ضرورت تھی کہ ایک معتبر نسخہ دیوان درد مرتب کیا جائے۔ لہٰذا ظہیر صاحب نے ۱ دیوان درد (قلمی) ۱۲۲۲ھ نسخۂ قلمی ۱۲۶۸ھ ۳ نسخہ قلمی مخزونہ انجمن ترقی اردو۔ ۴ دیوان درد مطبوعہ محمدی پریس ۱۲۷۱ھ۔ ۵ مطبوعہ نظامی پریس بدایوں ۱۹۳۳ء۔ ۶ مطبوعہ مجلس پریس دہلی ۱۲۷۸ھ۔ ۷ مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۲ء۔ ان نسخوں کو سامنے رکھا۔ اب سوال یہ تھا کہ ان نسخوں کی موجودگی میں کس نسخے کو اساس بنایا جائے۔ اس کے بارے میں اپنے مقدمہ میں ظہیر صاحب نے لکھا ہے۔

''بعض نسخوں کی قدامت نے دامن دل کھینچا۔ بعض کی نسبتاً صحت نے سفارش کی مگر مصیبت یہ تھی کہ اول الذکر عموماً صحت سے دور تھے اور ثانی الذکر قدامت سے مہجور۔ آخر میں مخطوطہ نسخہ ۱۲۲۲ھ کے حق میں دل نے گواہی دی کیونکہ یہ بہت حد تک قدیم بھی تھا۔

وسیع نہ سہی مگر وہ مفید اور تعمیری تھیں۔

مختصر یہ کہ بچپن کی جس چیز کے بارے میں بھی آج سوچتا ہوں تو لگتا ہے زندگی کے اس دشوار گزار راستے پر چراغ جل گئے ہیں اور اس منزل پر پہنچ کر جس کو بزرگی یا بوڑھاپا کہتے ہیں ہمیں فکروں اور مسائل نے اس طرح جکڑ لیا ہے کہ یہ یادیں ہی ہمارے لئے بہت بڑا سہارا لگتی ہیں۔ آج فکروں نے جب انسان کی کمر کو جھکا دیا ہے۔ رشتے اور تعلقات ایک ایک کر کے ٹوٹتے جاتے ہیں اس وقت یہی دعا دل سے نکلتی ہے:

بوڑھاپے کی دانائی لے کر کوئی
بدل دے وہ بچپن کی نادانیاں

☆☆☆

دوسرے اور تمام نسخوں کے مقابلہ میں مکمل اور متعدد اضافِ سخن پر حاوی تھا۔ تیسرے اس کی کتابت نہایت واضح اور صاف تھی۔ چوتھے ترقیمہ میں سال و مقام کتابت صاف صاف مندرج تھے۔

چنانچہ اسی نسخہ کو اساس بنا کر کام شروع کیا گیا اور متن کی صحت کے لئے یہ اصول پیش نظر رکھا کہ متن میں شعر کی صحیح اور مرجح صورت پیش کی جائے۔ غیر مرجح یا غلط شکلیں حاشیہ میں ماخوذ عنہ کے حوالے سے شامل کی جائیں۔''

ظہیر صاحب کے مرتب کئے ہوئے دیوان سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ بعض اشعار میں جدید املا کی پیروی کی ہے۔ چند الفاظ کی شکل میں جزوی تبدیلی آئی ہے۔ یہ الفاظ کی وہ شکلیں تھیں جو یا تو مصنف کے عہد میں رائج تھیں اور اب متروک ہو گئیں یا پھر کتابت و طباعت کی غلطیوں اور خامیوں کے باعث عام طور پر نسخوں میں راہ پا گئیں۔ مرتب دیوان مذکورہ اس تبدیلی و تغیر پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''اس تصرف کی محرک دو وجہیں تھیں۔ ایک تو یہ خیال ہوا کہ قارئین کرام کو جن کی نگاہیں جدید املا کی خوگر ہو چکی ہیں وحشت نہ ہو۔ اور دوسرے یہ کہ کاتبوں کی تحریفات وغیرہ سے شعر کے مفہوم یا وزن میں فرق نہ آئے۔ اسی بنا پر ایک، اک تیرے ترے، میرے، مرے یہاں اور یاں۔ وہاں اور واں۔ نیز یائے مجہول اور یائے معروف میں کاتبوں کی پیروی کرنے کی بجائے صحت اور موزونیت شعر کی رعایت ملحوظ رکھی البتہ لفظ اوس (بجائے اس) کو بجنسہ قائم رکھا ہے کیونکہ اس سے وزن میں کوئی فرق نہیں آتا۔ لفظ نیں'' (علامت فاعل) کی نسبت خاص طور سے معذرت کرنا ہے کہ راقم نے اس کو جدید استعمال کی رعایت سے لفظ ''نے'' سے بدل دیا ہے۔ البتہ جہاں لفظ مذکور آخر میں بطور ردیف استعمال کیا گیا ہے وہاں اسی طرح رہنے دیا ہے۔ یعنی ایسی غزلوں کو جن کے اشعار کے آخر میں ''نیں'' آیا ہے ان کو 'کے' کی ردیف میں شامل کیا ہے۔

یہی نہیں اس دیوان کی تصحیح اور ترتیب کے وقت قدیم اور مستند تذکرے بھی

ظہیر صاب کے پیش نظر رہے تا کہ مشترک اشعار کا مقابلہ ہو جائے اور کہیں کوئی کمی رہ گئی ہے تو وہ بھی دور ہو جائے۔ اس دیوان کی دوسری بڑی خصوصیت یہ ہے کہ فاضل مرتب نے متن سے پہلے ستر صفحات میں دردؔ کی شخصیت اور صوفیانہ شاعری، عشق مجازی عشق حقیقی اور طریقہ محمدیہ سے بحث کی ہے اور اس بحث سے ثابت یہ کیا ہے کہ دردؔ پہلے شاعر تھے بعد میں صوفی۔ چونکہ بعض نقادوں کو درد کے بارے میں یہ غلط فہمی تھی کہ وہ صوفی شاعر تھے۔ اور یہ کہ دردؔ کے چند متصوفانہ اشعار کی بنا پر انہیں بغیر سوچے سمجھے صوفی شاعر سمجھ لیا جاتا ہے۔ بعض نقادوں کا کہنا ہے کہ دردؔ صوفی تھے صوفی شاعر نہیں تھے۔ اسی بات کو ذرا بدل کر یوں بھی کہا گیا ہے کہ خواجہ میر درد کی زندگی صوفیانہ تھی مگر ان کی شاعری تصوف کی روایت کا حصہ نہیں۔ اس طرح کی گفتگو کے جواب میں ظہیر صاحب لکھتے ہیں

''ان کی مذہبیت اور ان کا تصوف رسمی نہ تھے بلکہ ان کی تمام ہستی میں رچے ہوئے تھے۔ یہ چیز محض بیعت اور سجادہ نشینی کے کاروبار تک محدود نہ تھی بلکہ اس نے ان کے اندر ایک لازوال استقامت بے نظیر استغناء زبردست قناعت اور ایک مخصوص میلان پیدا کر دیا تھا جیسا کہ ایک طرف تو ہمیں مختلف تذکروں سے پتہ چلتا ہے اور دوسری طرف انکے اردو و فارسی دواوین اور انکی صوفیانہ تصانیف سے ظاہر ہوتا ہے۔ ان کے فکر و عمل دونوں پر تصوف کی گہری چھاپ تھی۔ اسی لئے انکی شاعری میں درد و اثر ہونا قدرتی امر ہے۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ وہ پہلے صوفی تھے بعد میں شاعر۔ انکی شاعری تصوف کی تابع ہے تصوف شاعری کا تابع نہیں۔ اگر وہ شاعر نہ ہوتے تو بھی صوفی ہوتے''۔

خواجہ میر درد کے کلام کی داخلی شہادتیں ان کے عاشقانہ مزاج کی نشاندہی کرتی ہیں مگر محض عاشقانہ اشعار کی وجہ سے انہیں عاشق کہنا درست نہ ہوگا۔ دردؔ کے معاصرین اور تذکرہ نگاروں نے ان کے تعلق سے کوئی ایسی بات نہیں کہی جس سے انکے دنیاداری یا عشق بازی میں گرفتار ہونے کا اشارہ ملے۔ خود دردؔ کا قول ہے کہ وہ کبھی رسمی عشق بازی میں گرفتار نہیں ہوئے۔ ظہیر صاحب نے دردؔ کی فارسی تصنیف ''علم الکتاب'' سے جو عبارت نقل کی ہے اس کا ترجمہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

''خدا کے فضل سے فقیر کے اشعار رعایت شعری کے باوجود پیشہ شاعری اور خیالات ظاہری سے علاقہ نہیں رکھتے۔ میں نے کبھی شعر آمد کے بغیر صرف آورد سے موزوں نہیں کیا۔ نہ کبھی کسی کی مدح یا ہجو سے کام رکھا نہ کسی کی فرمائش پر یا آزمائش کی خاطر کچھ لکھا'' ایک دوسرے مقام پر درد لکھتے ہیں:

''الٰہی تو خوب جانتا ہے کہ طریق فقر اختیار کرنے سے پہلے بھی مجھے کسی کی محبت نہیں ہوئی کہ میری عقل وفہم پر غالب آتی۔ بلکہ میں مدت تک حکیمانہ مباحث میں مشغول اور طلب معاش میں مصروف رہا اور کچھ عرصہ تک صوفیوں کی طرح حقائق کا بیان کرتا رہا۔ آخر تیری کشش اور پیر ومرشد کی ارادت کا سلسلہ زلف محبوب کی طرح میرے لئے دام بن گیا جس کے باعث تیرے سوا سب سے قطع تعلق ہو گیا اور جس نے علاقۂ محمدی کے سوا مجھے تمام علائق سے آزاد کر دیا'' (ترجمہ)

خود خواجہ میر درد کی اس وضاحت بلکہ اعتراف کے بعد کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم یقین نہ کریں کہ کلام درد میں عشق مجازی کے اشعار غزل کی روایتی شاعری اور رنگ زمانہ کی دین ہیں۔ چونکہ درد مشاعروں میں شرکت کرتے تھے اور عام طور پر مشاعروں میں سامعین کو ذہن میں رکھ کر اشعار پڑھے جاتے ہیں اس لئے درد نے بھی روش عام کے مطابق شعر کہے۔ حافظ شیرازی کی تو پوری شاعری اپنی اصلی حقیقت اور مجازی نوعیت کو واضح کر چکی ہے۔ ہمارے عہد میں ریاض خیر آبادی نے خمریات کے شعر کہے۔ ان کا کلام پڑھ کر کوئی شخص یہی کہے گا کہ یہ شخص بلا کا میکش ہوگا جبکہ واقعہ اس کے خلاف ہے۔

ظہیر صاحب نے درد کی عشقیہ شاعری پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

''میر درد فرمائشی شاعری سے بھی انکار فرماتے ہیں اور عشق مجازی سے بھی برائت کا اظہار کرتے ہیں۔ ہماری رائے میں ان کے دونوں بیان قرین صدق وصواب ہیں۔ لیکن یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہئے کہ ہر کلیہ میں مستثنیات ہوتے ہیں۔ انکی شاعری پر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب شاعر نام نہاد عشق مجازی سے کنارہ کش رہا تو اس کے کلام میں یہ گداز

اور لوچ کہاں سے پیدا ہو گیا۔ خلیل الرحمن اعظمی کا کہنا ہے کہ ''اگر وہ اتنے ہی کھردرے سپاٹ اور لطیف خیالات سے خالی انسان ہوتے تو میرا خیال ہے وہ کسی عمر میں بھی صوفی نہیں ہو سکتے تھے''۔ ہمیں اعظمی صاحب سے اس حد تک اتفاق ہے کہ ایک کھردرے مزاج کا انسان جذبات عالیہ کا حامل نہیں ہو سکتا۔ لیکن کیا اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ شاہد بازاری کے ناز اٹھائے یا کسی خوبرو امرد ہی سے دل لگائے۔ ہو سکتا ہے کہ مشاہدۂ حق کی گفتگو کے لئے شیشہ و ساغر کے استعارات سے کام لیا جائے یا کسی انسان سے پاک اور سچی محبت کی جائے۔ یہ ہم اپنی طرف سے نہیں کہتے بلکہ خود درد کا بیان ہمارے اس خیال کا موید ہے۔ وہ کہتے ہیں:

''میں قلم کی عناں ایک طرف کو موڑتا ہوں اور جذبۂ محبت اس کو دوسری طرف پھیر دیتا ہے۔ جب یہ حال ہے تو لازم ہے کہ میں خود اپنے سے محبت کروں کیونکہ میں ہمہ تن اپنے محبوب کے جلوہ کا آئینہ دار بن گیا ہوں اور اپنے عندلیب کے نالے سن کر سراپا درد ہو گیا ہوں۔ میری آنکھ چشم خوباں کی طرح خود ہی بیمار ہے کہ ہر وقت اپنے محبوب کا جمال ہی اپنے اندر دیکھتی ہے اور میرا ہر رونگٹا زلف محبوباں کی مانند پریشان ہے کہ میرا ہر عضو معشوقوں کی ہی مدح میں تر زبان ہے'' (ترجمہ)

اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ انہوں نے اپنے شیخ طریقت (جو انکے اپنے والد ہی تھے) کے عشق میں اپنے کو مٹا دیا تھا۔ اور یہ محبت دراصل محبت رسولؐ کی اور محبت حق کی دین ہے۔ ان کا معشوق ایک آئینہ ہے جس میں محبوب حقیقی کا عکس جمیل نظر آتا ہے اور وہ جدھر بھی رخ کریں ان کا منظور وہی شبیہ جمیل ہے۔

اس بحث کے ساتھ ہی ظہیر صاحب نے خواجہ میر درد کے طریقہ محمدی اور اس کے بنیادی اصول پر روشنی ڈالی ہے۔ درد نے اپنی فارسی تصنیف میں اس کی تفصیل یوں بیان کی ہے۔

ایک مرتبہ میرے والد ماجد حضرت خواجہ ناصر عندلیب عالم استغراق میں ایک حجرہ میں بند ہو گئے۔ سات دن رات نہ اہل دنیا سے سروکار تھا نہ خواب و خور سے غرض۔

ادھر میں دہلیز پر سر رکھے روتا رہتا تھا اور کھانے پینے اور سونے سے قطعاً رغبت نہ تھی۔ آٹھویں روز حضرت نے حجرہ کا دروازہ کھولا اور مجھے زمین پر پڑا دیکھ کر اٹھایا اور سینہ سے لگا کر کلمات بشارت سے سرفراز فرمایا چنانچہ الحمدللہ کہ میں پہلا محمدی ہوں اور میں نے سب سے پہلے اس طریقہ محمدیہ میں موصوف سے بیعت کی ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ حضرت امام حسن کی روح کے فیضان سے یہ نسبت خاص مجھ پر القا ہوئی اور حکم ہوا کہ امت میں اس نسبت کی تبلیغ کی جائے۔ اور بتایا کہ امام مہندی کے زمانہ میں اس کا کامل ظہور ہوگا۔ میں نے امام عالی مقام سے دریافت کیا کہ آیا اس طریقہ کو ''طریقہ حسن'' کا نام دیا جائے تو امام نے ارشاد کیا کہ ہم سب بحر عینیت میں گم ہیں۔ ہماری دعوت ''دعوت محمدی'' ہے اور ہم نے سلوک نبوی پر کوئی اضافہ نہیں کیا ہے۔

میر درد کا کہنا ہے کہ محمدیہ کوئی نیا فرقہ نہیں ہے۔ جتنے اہل حق عہد رسالت سے اب تک ہوئے اور قیامت تک ہوں گے خالص محمدی ہیں۔ انہوں نے سراحت کی ہے کہ اہل سنت کے علاوہ جو دوسرے فرقے ہیں وہ بھی اس معنی کر محمدی ہیں کہ رسول مقبول سے نسبت کا دعوی رکھتے ہیں لیکن چونکہ وہ راہ سنت سے ہٹے ہوئے ہیں اس لئے محمدیت خالصہ سے دور ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب کے مقدمہ میں محمدیوں کے عقائد کی وضاحت کی ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ انکو عام صوفیاء کے غالیانہ افکار سے کوئی تعلق نہیں۔ ان کے عقائد وہی ہیں جو تمام اہل سنت کے یہاں مسلّم اور مقبول ہیں۔ ظہیر صاحب اس سلسلہ میں لکھتے ہیں ''جہاں تک ہم سمجھتے ہیں درد نہ تو مقلد جامد ہیں اور نہ کسی نئے فرقہ کے موجد۔ ان کی حیثیت ایک مجدد کی سی ہے۔ انہوں نے شریعت اور طریقت کو ملانے کی کوشش کی ہے اور جہاں افراط یا تفریط دیکھی اس پر بجا طور پر گرفت فرمائی ہے۔''

خواجہ میر درد اور انکے والد نے اپنے مشرب روحانیت کو طریقہ محمدی یا طریقۂ فقری کہا ہے۔ ان سے پہلے کے جتنے بھی بزرگ گزرے ہیں سب نے اپنے آپ کو نقشبندیہ کہا ہے۔ یہ سلسلہ جو خواجہ بہاالدین نقشبندی سے منسوب ہے تصوف کے چار معروف سلسلوں (قادریہ چشتیہ، نقشبندیہ سہروردیہ) میں دوسرے سب سلسلوں کے مقابلہ

میں زیادہ متشرع طریقہ ہے۔ خواجہ میر درد اور ان کے والد بزرگوار دونوں نے سلسلۂ نقشبندیہ سے اپنے روحانی تعلق کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ طریقۂ محمدیہ نقشبندیہ بزرگوں کے طریقہ سے الگ نہیں۔ اور اس کے بزرگوں (جیسے حضرت بہاالدین حضرت باقی باللہ) سے عقیدت کا اظہار کیا ہے۔

پروفیسر ظہیر صدیقی نے میر درد کے طریقۂ محمدیہ سے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''طریقۂ محمدی کا نصب العین یہ ہے کہ رسولؐ مقبول کی اطاعت میں اپنے کو یکسر گم اور فنا کر دیں۔ اسی بنا پر خواجہ موصوف احیائے دین یا تجدید کی اصلاح بھی گوارا نہیں کرتے۔ اس سے یہ خیال نہ کیا جائے کہ دوسرے مسلمان طریقۂ محمدی سے جدا ہیں۔ بلکہ وہ سب محمدی ہونے کے شرف سے مشرف ہیں۔ البتہ دونوں میں محمدیت خاص اور محمدیت عام کا فرق ہے۔ وحدت کے بارے میں درد کا یہ مسلک ہے کہ وہ صرف وجود حق کے قائل ہیں۔ اور کائنات کو کسی لحاظ سے حق تعالیٰ کا شریک نہیں ٹھہراتے۔ وہ کہتے ہیں کہ تعدد موجودات کا ماننا شرک ہے مگر کثرت موجودات ماننے سے شرک لازم نہیں آتا جب کہ ان موجودات کی ہستی اعتباری ہے۔ لہٰذا جو لوگ عبد و معبود اور ممکن و واجب کا فرق اٹھا دیتے ہیں وہ زندیق و ملحد ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ خواجہ میر درد کی شاعری توجہ طلب ہی نہیں بلکہ غور طلب بھی ہے۔ انکی شاعری کو ان کے طریقۂ محمدی کی روشنی میں پڑھنا اور سمجھنا چاہئے۔ ظہیر احمد صدیقی صاحب نے یہی کیا ہے۔ انہوں نے درد کی تصانیف بالخصوص ''واردات'' اور ''علم الکتاب'' کے مباحث سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ درد صوفی شاعر تھے۔ صدیقی صاحب کے مرتب کئے ہوئے دیوان درد کو اہل نظر نے محض ایک نصابی کتاب سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ اس کے مقدمہ کو بغور پڑھا جاتا اس پر تنقید و تبصرے ہوتے اور اسطرح میر درد کی تفہیم کے لئے کئی بند دروازے کھلتے اور درد شناسی میں مدد ملتی۔ ظہیر صاحب کی یہ کاوش ہر اعتبار سے لائق توجہ ہے اور طلبہ اور عام قاری کے لئے یکساں مفید ہے۔

ڈاکٹر محمد نفیس حسن، دہلی

نقش ظہیر...فانی کی شاعری

بیسویں صدی عیسوی کا نصف آخر اردو کی جن ادبی شخصیات سے مزین ہے ان میں پروفیسر ظہیر احمد صدیقی کی شخصیت بھی قابل ذکر ہے۔ شعروسخن اور علم وادب آپ کی خاندانی روایت رہی ہے۔ آپ کے دادا، تایا اور چچا شعروسخن میں اور والد عربی وفارسی زبان میں ممتاز تھے۔ والد محترم جناب ضیاء احمد بدایونی صاحب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شعبۂ فارسی کے معروف استاد تھے اور صدر شعبۂ بھی۔ آپ کا خاندانی سلسلہ اگرچہ سرزمین بدایوں سے تھا مگر آپ کی تعلیم وتربیت علیگڑھ کی علمی فضا میں ہوئی۔ والد محترم مولوی ضیا احمد بدایونی کے علاوہ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کی درسگاہ علمی میں آپ کو اپنے عہد کے نامور اساتذہ علم و ادب سے اکتساب واستفادہ کے مواقع حاصل ہوئے۔ آپ کی شخصیت میں علی گڑھ کی علمی و ادبی فضا کا گہرا اثر تھا۔ 1953 میں امتیازی نمبروں سے ایم اے اردو کرنے کے بعد کچھ وقت کے لئے آپ بحیثیت استاد علیگڑھ میں رہے مگر اردو ادب کی تدریسی خدمت کے لئے قدرت نے آپ کو دہلی کے لئے قبول کیا تھا چنانچہ 1955 میں دہلی کالج میں لیکچرار مقرر ہوئے۔ بعدازاں 1962 میں کالج سے شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی میں بحیثیت ریڈر قدم رکھا پھر آپ پروفیسر بھی ہوئے اور ڈین فیکلٹی آف آرٹس کے منصب پر بھی فائز رہے۔ دوران ملازمت بھی آپ کا علمی سفر جاری رہا۔ فارسی میں ایم اے کیا اور اردو میں پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی بچپن ہی سے آپ محنتی اور متحرک تھے اور یہی مزاج ہمیشہ رہا۔ متعدد علمی

انجمنوں ادبی رسالوں اور سیمیناروں سے وابستگی رہی۔ مختلف علمی وادبی کمیٹیوں میں آپ کی شمولیت رہی۔ آپ ہر دعوت پر لبیک کہتے اور ہر سفر کے لئے ہمیشہ کمر بستہ رہتے۔ شاید اقبال کے اس خیال کی عملی تعبیر۔ سفر ہے حقیقت حضر ہے مجاز۔ اس اعتبار سے آپ کا شمار سب سے زیادہ سفر کرنے والے اساتذہ کی صف میں ہوگا۔ آپ کے علمی وادبی اسفار کی تعداد بلا شبہ سینکڑوں سے متجاوز ہوگی۔ اسفار کی کثرت سے آپ کی فعال اور پیہم دواں شخصیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ بلاشبہ آپ کا شمار ان اساتذہ میں ہوتا ہے جو تصنیف و تالیف اور درس و تدریس دونوں سے مزین تھے۔ حلقۂ یاراں اور شاگرداں دونوں میں آپ یکساں طور پر مقبول تھے۔ تہذیب وشرافت اور اخلاق واقدار پر مبنی آپ کی شخصیت کا نقش ہر جگہ گہرا تھا۔ آپ کی طبعیت میں سنجیدگی و بذلہ سنجی (Humour) دونوں کا متوازن امتزاج تھا۔ اس امتزاج میں اپنے والد جناب ضیاء احمد بدایونی اور استاد محترم پروفیسر رشید احمد صدیقی کی تربیت کا خاص اثر تھا۔ ظہیر صاحب کم گو تو نہ تھے لیکن بسیار گوئی بھی مزاج نہ تھا۔ موقع ومحل کے مطابق ہر شخص سے اپنے تعلق کے مطابق گفتگو فرماتے۔ آپ کا شمار ان ادبی شخصیات میں ہوتا ہے جنہیں اپنے علم ولیاقت پر کوئی ادعا یا زعم نہ تھا۔ اپنی کسی غلط بات کو مان لینے میں بھی کوئی ہچکچاہٹ نہ ہوتی، بڑا یا چھوٹا خواہ کوئی شخص اس طرف توجہ دلائے۔ بلاشبہ آپ قدروں کے پاسدار اور ایک نفیس انسان تھے۔ دوستوں کے دوست یاروں کے یار۔ اپنے آپ کو اردو کا کوئی بڑا اسکالر کہلانے یا سمجھنے پر انہیں نہ کوئی اصرار تھا نہ وہ اس کے خواہشمند تھے۔

آپ کی شخصیت کا سب سے نمایاں وصف ہے سادگی۔ لباس، وضع قطع گفتگو اور طرزِ حیات ہر اعتبار سے آپ کی زندگی سادگی کا نمونہ تھی۔ ظاہر داری، تصنع اور دہرے کردار سے آپ کی طبعیت کو کوئی مناسبت نہ تھی۔ کج کلاہی یا کج ادائی سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ ادبی حصار اور گروہ بندی کے اس دور میں آپ کو ہر جگہ قدر ومنزلت حاصل تھی۔ آپ کی شخصیت اردو دنیا کے حلقہ پر محیط تھی۔ کل ہند ادبی منظر نامے سے علم وواقفیت آپ کو مضطرب اور بے چین رکھتی۔ آپ کی محفل علمی گفتگو اور ادبی شایستگی کا آئینہ ہوتی۔ یہ آپ کی خاندانی

شرافت اور فطری سادگی کا خاصہ تھا کہ آپ کے یہاں تضحیک استہزاء، یا ہجو کا گزر نہ تھا جو ہماری ادبی تاریخ کا ایک مذموم جزو رہی ہے۔ طلبا کے ساتھ محبت ہمدردی بھی آپ کی اہم خصوصیت تھی مختصر یہ کہ آپ کی شخصیت تہذیب شرافت اور اخلاق واقدار کا آئینہ تھی۔ آپ کی تصانیف کے موضوعات بھی آپ کی شخصیت ہی کا پرتو ہیں۔ ان میں 'مومن شخصیت اور فن' 'خواجہ میر درد'، 'فانی کی شاعری'، 'تحقیقی مطالعہ حالی'، 'بچوں کے درد'، 'فکری زاوئے' اور 'احساس وادراک' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

کلاسیکی ادب بالخصوص غزل آپ کا پسندیدہ موضوع تھا اور اس میں بھی اختصاص مومن اور اس کے کلام کے ساتھ تھا۔ اسی موضوع پر آپ نے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔ 'مومن شخصیت اور فن'۔ آپ کی تحقیقی کاوش کا وقیع ثمرہ ہے۔ اس کے علاوہ آپ کی دوسری تصانیف میں ''فانی کی شاعری'' بھی ایک اہم تصنیف ہے۔ زیر نظر مضمون میں ظہیر صاحب کی ادبی خدمات کا جائزہ اسی تصنیف کی روشنی میں لینے کی کوشش کی گئی ہے۔

آپ کی یہ تصنیف 'فانی کی شاعری' دراصل اس مقالے کی اشاعتی شکل ہے جسے آپ نے ایم اے اردو کے پرچے کی جگہ برائے مقالہ ''فانی کا غم'' عنوان سے انتخاب کیا تھا۔ فانی بدایوں کے رہنے والے تھے اور ظہیر صاحب کا تعلق بھی سرزمین بدایوں سے تھا۔ اس طور پر کہا جا سکتا ہے کہ مقالہ کے موضوع کے انتخاب میں فانی سے ظہیر صاحب کی وطنی انسیت وقربت بھی کارفرما ہے۔ فانی سے آپ کو بچپن ہی سے فکری وذہنی مناسبت تھی۔ اسکول کی تعلیم کے زمانہ سے ہی آپ فانی سے متاثر تھے۔ خاص طور پر اس شعر نے آپ کو فانی کا گرویدہ بنا دیا تھا۔

وہاں سجدے سے اب تک قدسیوں کے سر نہیں اٹھے
پڑا تھا جس جگہ راہ محبت میں قدم میرا

دور طالب علمی ہی سے آپ کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ فانی کے نقادوں نے فانی کے ساتھ انصاف نہیں کیا اور اسے محض ایک قنوطی اور یاسیت کا شاعر کہہ کر کنارے لگا دیا۔

اس موضوع کے انتخاب سے متعلق ظہیر صاحب نے کتاب کے پیش گفت میں لکھا ہے:

''فانی کے غم کے متعلق یہ غلط فہمی عام ہے کہ ان کا غم انسانی ولولوں اور ترقی کے جذبہ کا منافی ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ اس غلط فہمی کو دور کر کے ان کے غم کا درجہ متعین کر دیا جائے''۔

فانی کی شاعری کی اشاعت 1969 میں ہوئی دوسرا ایڈیشن کچھ ترمیم واضافے کے ساتھ 1981ء میں شائع ہوا۔ اس دوران فانی سے متعلق ناقدین کے مختلف رویوں کے باوجود ظہیر صاحب پر فانی کا نقش مزید گہرا ہوتا گیا۔ اس کتاب کے سات ابواب میں فانی کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ 'فانی کا ماحول اور شخصیت' باب میں فانی کی شاعری کے پس منظر کو پیش کیا گیا ہے۔ 'فلسفۂ غم اور عشق' باب میں فانی کے غم کی نوعیت اور اسکے غم کے داخلی و خارجی اسباب کا تفصیلی ذکر ہے 'فانی کا تصوف' باب میں فانی اور درد کے متصوفانہ رجحان کا تقابلی جائزہ لیا گیا ہے۔ 'میر غالب اور فانی' باب میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ان تینوں شعراء کے مابین فلسفۂ غم سے متعلق کہاں تک ہم آہنگی ہے اور کس قدر دوری۔ 'فانی اور معترضین' باب میں ظہیر صاحب نے فانی کے ناقدین کے اعتراضات کا محاکمہ کیا ہے' اردو غزل میں فانی کا مقام' عنوان سے ضمیمۂ اول میں فانی کے کلام میں ان الفاظ و تراکیب کی نشاندہی کی ہے جو فانی سے مخصوص ہیں ضمیمۂ دوم میں مصنف نے جن کتب و رسائل سے استفادہ کیا ہے نیز جو مطالعہ فانی میں بھی اہم ہیں۔ ان کی فہرست سازی کی ہے فانی کی شاعری کے مختلف ادوار اور اسکے رنگ شاعری کی ترجمانی کے احساس سے ایک مختصر انتخاب کلام فانی پر اس کتاب کا اختتام ہوتا ہے۔

فانی کی شخصیت میں انکے ماحول کے اثرات کے ذیل میں ظہیر صاحب نے بدایوں کی علمی و تہذیبی زندگی مذہب اور مذہبی روایات سے گہری وابستگی اور شعر و ادب سے معمور فضا کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے اور خودداری عالی ظرفی المیہ زندگی سے لذت و حصول

(حصہ دوم)

میں ان خوش قسمت لوگوں میں ہوں جن کو ہر جگہ ماحول علمی ادبی اور مذہبی ملا۔ بدایوں میں جس خاندان میں پیدا ہوا وہاں مذہب اور ادب کے چرچے تھے۔ بچپن سے وہ آوازیں کان میں پڑتی رہیں۔ دادی، پھوپی اور تایا جج کی سعادت حاصل کر چکے تھے۔ یہ میرے بچپن کی بات ہے اور بعد کو خاندان کے متعدد لوگوں کو یہ سعادت حاصل ہوئی۔ علمی اور ادبی ماحول کا یہ حال تھا کہ دادا رفیع احمد عالی۔ تایا رضی احمد رضی والد ضیاء احمد ضیاء اور چچا آفتاب احمد جوہر شاعر تھے۔ ان کے شعر و ادب کا اعتراف ممتاز اہل قلم نے کیا ہے۔ والد کے چچا شفیع احمد محو اور مولوی مطیع احمد رخشاں امیر مینائی کے شاگرد تھے۔ ان حضرات کو تو میں نے نہیں دیکھا مگر ان کا ذکر ہر وقت رہتا تھا۔ جب احباب جمع ہوتے تو مذہبی واقعات کا ذکر ہوتا یا شعر و ادب کا تذکرہ ہوتا۔ میرے بڑے بھائی حبیب احمد صدیقی حبیب مرحوم اور رفیق احمد میکش مرحوم بہت اچھا شعر کہتے تھے۔ چچا صاحب قبلہ کا کلام سن کر فراق نے کہا تھا کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بدایوں خود ایک دبستانِ شاعری ہے۔

جہاں تک میرے مسلک کا تعلق ہے اس کا اظہار ضروری ہے کہ میں اول بھی مسلمان ہوں اور آخر بھی مسلمان ہوں۔ ابتدا میں ممکن ہے کہ میں مسلمان اس لئے ہوں

عشرت خاموشی وسنجیدگی وغیرہ کوان کی شخصیت کے بنیادی عناصر کے طور پر پیش کیا ہے۔ فانی کی شاعری اور شخصیت دونوں میں کامل ہم آہنگی محسوس کی ہے اس کے ضمن میں خاص طور پر یہ الفاظ اہم ہیں۔

''فانی کی ذات اپنے دور ہی کی نہیں بلکہ تاریخ ادب اردو کے ان چند نفوس میں سے تھی جن کے یہاں زندگی اور شعر میں کامل ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ ان کی شاعری کے موضوعات غم، عشق، جبر، ہمہ اوست، ناپائیداری دنیا، بے ثباتی کائنات، کسی بھی عنوان کو لے لیجئے اور فانی کی زندگی سے ان کا رشتہ ملائے ان میں وہی صداقت ملے گی جو ایک سچے انسان اور سچے فن کار کے یہاں ضروری ہے۔

اس میں شک نہیں کہ فانی کے یہاں غم زندگی کی ناگزیر حقیقت ہے اور اسے اپنانے، گلے لگانے، نکھارنے اور سنوارنے کا جذبہ ہمیشہ کارفرما رہا ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ غم کی اس ذاتی اور شخصی نوعیت میں فلسفیانہ گہرائی ہے۔ اسی لئے ان کی شاعری کو کتابِ غم کی تفسیر کہنا اور ان کی ذات کو شارحین غم میں سب سے ممتاز ومنفرد سمجھنا بھی غلط نہیں ظہیر صاحب نے فانی کے فلسفہ غم کو وجودی (Existential) خیال کیا ہے اور وحدت الوجود کے نظریے کو فانی کے فکر وخیال پر محیط محسوس کیا ہے اس ضمن میں ظہیر صاحب لکھتے ہیں۔

''انہوں نے وحدت الوجود کو ہمیشہ اپنے لئے اکسیر بھی سمجھا ہے اور ہر مرض کی دوا بھی۔ اس نے ان کی روحانی تعمیر میں حصہ لیا ہے اور ذہنی سکون کے کام بھی آیا ہے۔ ان کے یہاں عشق کا تصور عام طور سے عشق حقیقی کے معنی میں آیا ہے اور وحدت الوجود کا عقیدہ ان پر اس قدر حاوی ہے کہ عشق مجاز کا رنگ اس کے سامنے پھیکا پڑ گیا ہے۔

فانی کا کلام ظہیر صاحب کے نزدیک نظریاتی اعتبار سے تصوف سے مرصع ہے مگر تصوف سے متعلق موضوعات کے بیان میں ان کی زندگی کے اپنے تجربات ہیں۔ جو تلقین محض نہیں بلکہ حسن کلام سے عبارت ہیں۔ فانی کا کلام اس کے باوجود کہ غم سے معمور ہے لیکن یہ غم عشق کا شدید جذبہ ہے اور بلند تخیل کے ساتھ ہے۔ ظہیر صاحب نے فانی کے کلام

کی اس خصوصیت کے ذیل میں سراحت کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔

''فانی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے غم کی گرانباری کے باوجود کہیں بھی تخیل اور جذبہ کے امتزاج کو فراموش نہیں کیا ہے جس کی وجہ سے اسکا جمالیاتی حسن برقرار رہا۔ ان کے کلام میں رکاکت اور ابتذال کا نام نہیں اور اگر یہ کہا جائے کہ وہ ان گنے چنے افراد میں سے ہیں جنہوں نے اُردو شاعری کو پستی سے نکالا۔ غزل کو آبرو بخشی اور اس میں وہ لطافت سموئی جو فارسی غزل کے حصے میں آئی ہے تو شاید مبالغہ نہ ہو۔''

ظہیر صاحب نے فانی سے متعلق اس خیال کی بھی تردید کی ہے کہ وہ قنوطی ہیں کلام فانی کی متعدد مثالوں سے آپ نے فانی کے ہاں عزم و یقین کے واضح تصور کو اجاگر کیا ہے۔ ''فانی اور معترضین'' باب میں ظہیر صاحب نے فانی سے متعلق ناقدین کے مختلف اعتراضات پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ مثلاً یہ اعتراض کہ ان کے کلام میں ادب برائے زندگی کا فقدان ہے۔ ان کا درد و یاس نہ صرف شاعری بلکہ زندگی کے بے حد مضر ہے۔ نوجوانوں کے عزم اور ولولوں کے فروغ کے لئے زہر قاتل ہے۔ ان کی شاعری نے ہمیں کچھ نہیں دیا۔ یا یہ اعتراض کہ ان کا تصوف حقیقی نہیں ہے کیونکہ یاس اور تصوف دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اسی طرح ایک اور اعتراض یہ کہ ان کے یہاں بے کیف یک رنگی ہے۔ خیالات میں تنوع نہیں۔ ٹھوس خارجی احساس کا فقدان ہے اور اسکی تخیل بزم تماشہ تک محدود ہے۔

فانی سے متعلق اظہار خیال میں ظہیر صاحب نے کہیں کہیں مبالغہ سے بھی کام لیا ہے۔ میر غالب اور فانی باب میں میر اور فانی کے تقابلی تجزئے میں ظہیر صاحب نے جو احساسات پیش کئے ہیں ان سے بڑی حد تک اتفاق کے باوجود اختلاف کی گنجائش بھی ہے۔ مثلاً، فانی سے متعلق یہ ادّعا کہ ان کی فکر غالب سے زیادہ گہری اور پیچیدہ نظر آتی ہے۔ اسی طرح ظہیر صاحب کے اس خیال سے بھی اتفاق مشکل ہے کہ 'اردو کی صوفیانہ شاعری میں سوائے اصغر کے کوئی شاعر فانی کے قریب نہیں پہنچ پاتا'۔ یا یہ کہنا کہ ان کا غم میر

کے غم سے زیادہ لطیف اور ان کی تخیل غالب کی تخیل سے زیادہ بہتر ہے۔

فانی سے متعلق ناقدین کے مختلف اعتراضات پر ظہیر صاحب کی تنقید یا تردید نیز فانی سے متعلق ان کے فکر و احساس کے اظہار میں ضروری نہیں کہ ان سب سے اتفاق کیا جائے لیکن یہ ضرور ہے کہ آپ نے بڑی حد تک فانی کی انفرادیت اور ان کے شاعرانہ مقام کو اجاگر کرنے کی سنجیدہ کوشش کی ہے۔ اس لئے آپ کی یہ تصنیف ''فانی کی شاعری'' فانی شناسی میں خصوصیت سے اہمیت رکھتی ہے اور اسے ایک گراں قدر تصنیف کہنا مبالغہ نہ ہوگا۔

☆☆☆

ڈاکٹر مظہر احمدؔ
ذاکر حسین کالج، دہلی۔

ظہیر احمد صدیقی سے میری پہلی ملاقات

استادِ محترم سے میری پہلی ملاقات مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔ اس لئے کہ روز اول ہی سے ان کی مشفقانہ نگاہوں کے مرکز میں ہوں اور انعام واکرام اور حوصلہ افزائی کا سلسلہ بھی اسی پہلی ملاقات سے جاری ہے۔ یادش بخیر! ۱۹۸۴ء کا تعلیمی سال اپنے عہد شباب میں تھا اور میں ذاکر حسین کالج میں بی۔اے۔ آنرز کے تیسرے سال کا طالبِ علم تھا۔ شعر و شاعری کا چسکہ لگ چکا تھا۔ تھوڑی بہت قافیہ پیمائی بھی ہو جاتی تھی۔ کہ اچانک سینٹ اسٹیفنس کالج سے ایک دعوت نامہ موصول ہوا۔ ''بزم سخنورانِ مکتب'' نے ایک مشاعرے کا انعقاد کیا تھا جس میں صرف کالج و یونیورسٹی کے شعرا حضرات شریک ہونے تھے۔ مجھے بھی شاعر کی حیثیت سے بلایا گیا تھا۔ میں محفلوں کی بہ نسبت تنہائیوں کا پروردہ تھا۔ اسی لئے اس قسم کی تقریبات سے نظریں چراتا تھا۔ مگر استادِ محترم مشیر جھنجھانوی مرحوم کے اصرار پر ڈرتے ڈرتے مشاعرے مین شریک ہوا۔ اسٹیفنس کالج کے ہال میں مجھے پتہ چلا کہ مشاعرے کی صدارت کے سلسلے میں ایک مسئلہ درپیش ہے۔ کارڈ کے مطابق صدارت شعبۂ اردو کے صدر ڈاکٹر شریف احمد صاحب کو کرنی تھی مگر چند روز پہلے شعبۂ اردو کی صدارت پروفیسر ظہیر احمد صدیقی صاحب کو منتقل ہو گئی تھی۔ اب یہ دونوں حضرات ایک دوسرے کے حق میں صدارت کی کرسی سے دست بردار ہونے کی ضد کر رہے تھے۔ ظہیر صاحب مصر تھے

کہ شریف صاحب ہی صدارت کے فرائض انجام دیں۔ دس سال پہلے کا یہ واقعہ آج ایک مثال ہے۔ بظاہر بات بڑی معمولی ہے مگر ان ہی معمولی باتوں سے کردار ڈھلتے ہیں، پہچان بنتی ہے اور انسانیت سنورتی ہے۔ اس پہلی ملاقات کا یہ واقعہ میرے دل میں گھر کر گیا اور دونوں اساتذہ کی ایک دوسرے سے محبت اور دوستی کی دلیل بھی ثابت ہوا۔ مشاعرے کے اختتام پر تمام طالب علم شعرا کو کچھ کتابیں اور فائل وغیرہ بطور تحفہ پیش کی گئیں اور وہ بھی استاد محترم ظہیر احمد صدیقی صاحب کے دستِ مبارک سے۔ مجھے انعام سے نوازتے ہوئے انھوں نے میری پیٹھ ٹھونکی اور حوصلہ افزائی بھی کی۔ اور تب سے اب تک ان کی حوصلہ افزائی کا سلسلہ جاری ہے۔

استادِ محترم سے میری یہ پہلی روبرو ملاقات تھی۔ مگر ایسا نہیں تھا کہ میں ان کے نام سے ناواقف تھا۔ دراصل بی۔ اے کے سالِ اول ہی سے دو نسبتوں سے میں انھیں پہچانتا تھا۔ پہلی اور سب سے اہم نسبت استادِ محترم کی وہ کتابیں تھیں۔ جنہیں انھوں نے ایڈٹ کیا تھا اور جو ابتدا ہی سے میرے مطالعہ میں رہی تھیں۔ خاص کر دیوانِ فانی، دیوانِ درد اور مثنوی سحر البیان و گلزارِ نسیم جو میرے کورس کا حصہ تھیں۔ تدوین ترتیب کے معیار سے ان کتابوں کی جو بھی حیثیت ہو مگر ان کے گراں قدر طویل مقدمے مجھ جیسے، طالب علموں کے لئے آج بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان مقدموں میں جہاں ایک طرف شاعر کے حالات بہ تفصیل بیاں کے گئے ہیں۔ وہیں دوسری طرف ان شعراء کے شعری محاسن اور ادبی مرتبے سے بھی بحث کی گئی ہے۔ دیوانِ درد کا مقدمہ آج بھی اپنی اہمیت رکھتا ہے اور اسی کے مطالعے سے میں نے پہلے پہل تصوف جیسے فلسفیانہ اور دقیق موضوع کو سمجھنے کی کوشش کی۔

تو میں ذکر کر رہا تھا کہ بی۔ اے کے سالِ اول سے ہی میرا غائبانہ تعارف استادِ محترم سے ہو گیا تھا۔ اس تعارف کی دوسری نسبت یہ تھی کہ میری استادِ محترم بیگم افتخار صدیقی، مشرقی رواداری کی پروردہ، سراپا شفقت و محبت، بہت اچھی استاد۔ انہوں نے ہی بی۔ اے کے دوران ''ادب'' کی ابتدائی تعلیم سے مجھے اور میرے ساتھیوں کو آراستہ کیا۔ اپنے نرم لہجہ اور اندازِ گفتگو کے ساتھ ساتھ درس و تدریس کے اچھوتے طریقوں سے وہ ہمیشہ ہر دل عزیز

بنی رہتی ہیں۔ ہم نے کتاب پر انگلی رکھ کر ان سے شاعری پڑھی ہے۔ طویل عرصے تک مجھے معلوم ہی نہ ہو سکا کہ جن پروفیسر ظہیر احمد صدیقی کی کتابوں سے میں استفادہ کرتا ہوں وہ میڈم کے شوہر ہیں۔ اور جب معلوم ہوا اور خود بھی ایم۔ اے میں استادِ محترم کا شاگرد ہونے کی سعادت نصیب ہوئی تو اپنی خوش نصیبی پر پھولا نہ سمایا۔

جیسا کہ میں نے ابتدا میں تحریر کیا کہ میں استادِ محترم کا شاگرد ہوں اور اسی نسبت سے ان کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں لہذا آمدم برسر مطلب۔ ایم۔ اے کے دوران شعبۂ اردو کی صدارت آخری بار استادِ محترم کے ذمہ تھی۔ میں تو خیر دہلی کا ہی روڑا تھا۔ ایم۔ اے۔ کے دونوں سال بڑی مصروفیت کے سال تھے۔ کلاسیں بڑی پابندی سے ٹائم ٹیبل کے مطابق ہوتی تھیں۔ شعبۂ کا آفس صبح نو بجے کھل جاتا تھا اور ساڑے نو بجے کلاسوں کا سلسلہ جاری ہو جاتا تھا۔ ہم تمام طلباء و طالبات وقتِ مقررہ پر یونیورسٹی آجاتے تھے۔ استادِ محترم بھی ٹھیک ساڑھے نو بجے تشریف لے آتے تھے۔ اکثر پہلی کلاس ان ہی کے ساتھ ہوتی تھی۔ بلکہ کبھی کبھی وہ شعبہ کے کمرے سے باہر آکر ہم سے پوچھتے، کس کے ساتھ کلاس ہے۔ ہم بتاتے اگر وہ استاد نہ ہوتے تو وہ خراماں خراماں کمرہ نمبر ۷۶۔۷۷ کی طرف روانہ ہوتے اور درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیتے۔ استاد کا لیکچر نہایت دلچسپ اور پراز معلومات ہوتا۔ مخصوص لب ولہجہ کی وجہ سے ایک سماں سا بندھ جاتا اور ہم سب پر ایک سحر سا طاری ہو جاتا۔ یہ مبالغہ نہیں، حقیقت ہے۔ کیونکہ استاد کے لیکچر میں لفاظی کم سے کم ہوتی (آج کل کے لیکچر میں صرف لفاظی ہوتی ہے معلومات نہیں) بڑا مدلل اور نپا تلا لیکچر ہوتا۔ وہ چاہے حسرتؔ کی غزل ہو چاہے مومنؔ کا تصورِ عشق غالبؔ کی خودداری ہو چاہے اقبال کا فلسفہ ان کی تدریس کی ایک خوبی یہ تھی کہ ان کا لیکچر ہمارے ذہنوں میں محفوظ ہو جاتا اور اکثر امتحانات میں بھی وہی لیکچر کتابوں کے مقابلے زیادہ کام آتا۔ اقبال کی غزلیں اور نظمیں۔ ذوق وشوق، مسجد قرطبہ وغیرہ لفظ لفظ انہیں نے پڑھائی ہیں۔ خاص کر "ابلیس و جبریل کی ڈرامائی کیفیت مکالموں کی برجستگی اور اقبال کی فکر کے تعلق سے ایک لیکچر تاحیات یاد رہے گا۔ گو اس کے علاوہ اخلاقی تعلیم کا سلسلہ بھی روز اول سے جاری رہتا۔ بزرگوں کی عزت

۔ماں باپ کا مرتبہ (حالانکہ یہ باتیں پرائمری میں سمجھائی جاتی ہیں) اساتذہ کا احترام اور دنیاداری کی ان گنت باتیں اور نصیحتیں بھی ان کے لیکچر کا حصہ ہوا کرتی تھیں۔ لیکچر ختم کرنے کے بعد وہ اپنے طلبا سے سوال پوچھنے کے متمنی رہتے تھے۔ اور ان کا آخری جملہ یہ ہوتا کہ اب آپ اس لیکچر کے پس منظر میں ابھرنے والا کوئی سوال کریں۔ اس طرح وہ ہماری جھجک اور شرم دور کرنے کی کوشش کرتے اور سوال پوچھ کر ہی کلاس چھوڑتے۔

ابھی میں نے اخلاقی تعلیم کا ذکر کیا۔ اس ضمن میں مجھے ایک واقعہ یاد آرہا ہے۔ جس سے اندازہ ہوگا کہ اپنے شاگردوں کی تربیت میں استاد کتنی دلچسپی لیتے تھے۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی صاحب نے دہلی میں اردو درس و تدریس کے سلسلے میں جو کاوشیں کی ہیں ان کا اعتراف کیا جا چکا ہے۔ ہم جو آج یہاں نظر آرہے ہیں یہ بھی ان ہی کا فیضان ہے۔ خواجہ صاحب نے شعبۂ اردو کو بنایا سنوارا اس کے اعتراف میں شعبۂ اردو نے ایک گولڈ میڈل کی ابتداء کی جو ہر سال اس طالب علم کو دیا جاتا ہے جس نے ایم۔اے میں امتیازی نمبر حاصل کئے ہوں۔ (اس گولڈ میڈل کی ابتداء بھی استاد محترم کی کوششوں کا ثمرہ ہے) خوش قسمتی سے میں نے بھی ایم۔اے میں پہلی پوزیشن حاصل کی اور اس گولڈ میڈل کا حقدار ٹھہرا۔ سالانہ کانوکیشن سے چند روز پہلے استاد محترم نے مجھے نصیحت کی کہ سب سے پہلے گولڈ میڈل لیکر میں خواجہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوں اور ان سے دعائیں لوں بعد میں کہیں اور جاؤں۔ میں خواجہ صاحب کے دولت خانے پر پہنچا۔ اتنی محبت اور شفقت اور دعائیں ملیں کہ جی خوش ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ سب استاد کی تلقین کا ہی پھل تھا۔ میری پہلی کتاب چھپی جس کا انتساب والدین کی طرف تھا۔ دیکھا تو بہت خوش ہوئے اور کہا یہ تم نے بہت اچھا کیا جاؤ ان کی دعائیں لو۔

نگراں کی حیثیت سے استاد محترم کا رویہ اپنے شاگردوں کے لئے ہمیشہ ہی قابل ستائش رہا۔ انہوں نے کبھی نہیں چاہا کہ شاگرد ان کے اردگرد پھریں۔ گھر کے چکر لگائیں اور بقول رضا نقوی واہی خدمتیں کرا کے مخدوم ہو جائیں۔ میں نے ایم۔فل اور پی۔ایچ۔ڈی کے مقالے ان ہی کی نگرانی میں مکمل کئے۔ ایم فل کے مقالے کی تیاری کے دوران

خلیل الرحمن اعظمی کے سلسلہ میں انہوں نے میری بے پناہ مدد کی۔ ان کے مجموعے از سر نو پڑھے اور ہمیشہ مفید مشوروں سے نوازا۔ دیگر اساتذہ سے استفادے کے دروازے بھی کھلے رکھے۔ خاص کر شریف صاحب فریدی صاحب اور قمر رئیس صاحب کے پاس بار بار بھیجتے۔ کتب و رسائل کی فراہمی کے لئے بھی کوشاں رہے۔ طنز و مزاح کے سلسلے میں کئی قیمتی اور گم شدہ کتابوں کی فراہمی میں مجھ سے زیادہ فکرمند رہتے اور اکثر ان کی فراہمی میں کامیاب بھی ہوتے۔

۱۹۸۷ء میں کروڑی مل کالج میں لیکچرشپ کے انٹرویو میں استاد ایکسپرٹ کی حیثیت سے موجود تھے۔ استاد محترم پروفیسر قمر رئیس صاحب بھی صدر شعبۂ کی حیثیت سے موجود تھے۔ خلاف توقع میرا انٹرویو اچھا ہوا اور بعد میں تقرر بھی ہو گیا۔ اس زمانے میں جب کہ استاد اپنے کسی ساتھی یا مہمان وغیرہ سے میرا تعارف کراتے تو شاگرد کے بجائے ساتھی کہہ کر مخاطب کرتے اور میں شرمندہ ہو جاتا۔ میں نے کئی بار ان سے کہا کہ میں ہمیشہ آپ کا شاگرد رہونگا اور میرا سب سے بڑا تعارف یہی ہے کہ میں آپ کا شاگرد ہوں مگر یہ ان کا بڑپن ہے کہ یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہا۔

استاد محترم کے مزاج میں ظرافت کا پہلو خاص اہمیت رکھتا تھا۔ ہلکے پھلکے خود ساختہ لطیفے ان کی گفتگو کو دلچسپ اور بے تکلف بنا دیتے تھے۔ اردو ناموں کا انگریزی ترجمہ بھی کیا خوب کرتے تھے۔ مگر ان کی گفتگو کی سب سے بڑی خصوصیت ان کا وہ مخصوص لب و لہجہ ہے جو ان کی پہچان بن گیا ہے۔ عرصہ پہلے رشید احمد صدیقی صاحب پر مضمون لکھتے ہوئے استاد نے اقبال کا ایک مصرعہ بطور عنوان استعمال کیا تھا۔ وہی مصرعہ خود استاد محترم کے مزاج اور لب و لہجہ کی نمائندگی کرتا ہے

''جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم''

آج استاد درس و تدریس کی ذمہ داریوں سے ہی نہیں دنیا سے بھی دور جا چکے ہیں۔ لیکن ان کی تربیت کا سلسلہ جاری ہے۔ ان کی شفقت اور علم کی لگن کی یاد ہمیں یہ احساس دلائے رکھتی ہے کہ استاد سے ملاقات ہوگی تو انہیں بتانے یا دکھانے کے لئے ہمارے پاس کیا ہوگا اور یہی احساس ہمیں علم و ادب کے میدانوں کی طرف لے جاتا ہے۔

ڈاکٹر توقیر احمد خاں
شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

ظہیر احمد صدیقی بحیثیت شاعر

استاذی پروفیسر ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی صاحب کو نقاد، محقق اور یونیورسٹی استاد کی حیثیت سے تو زمانہ جانتا ہے لیکن ان کے شاعرانہ کردار سے بہت کم لوگ واقف ہوں گے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ انھوں نے شاعر کی حیثیت سے اپنے آپ کو متعارف نہیں کرایا۔ اگرچہ ان کی طبعیت شعر گوئی کے لئے موزوں تھی اور وہ شعر کہتے تھے۔ لیکن اخفائے ذات انکی طبعیت کا جز تھی۔ وہ زبردستی اور کسی طور پر شعر کہنے کے قائل نہیں۔ جب تک شعر اپنے آپ نازل نہ ہو ظہیر صاحب شعر کہنے کی کوشش نہیں کرتے۔ راقم الحروف کو ان کی شعر گوئی کا راز اچانک فاش ہوا۔ ایک بار ۱۹۸۰ء میں ڈاکٹر سعادت علی صدیقی مرحوم نے سنبھل میں عاشق پبلک لائبریری کے گوشۂ شجاعت علی سندیلوی کا افتتاح استاد محترم (ظہیر صاحب) کے ہاتھوں کرایا۔ راقم دہلی یونیورسٹی میں ایم فل کا طالب علم تھا ظہیر صاحب کو دہلی سے سنبھل لانے کی ذمہ داری راقم کے سپرد کی گئی۔ افتتاح ہو چکا تو سنبھل میں ایک شعری نشست کا اہتمام بھی کیا گیا۔ اس نشست کی صدارت ظہیر صاحب نے کی اور پھر آخر میں اپنا کلام بھی سنایا۔ ظہیر صاحب نے اپنی شاعری کو اگر چھپوایا نہیں تو ایسا چھپایا بھی نہیں۔ اور اگر کہیں کسی ذی فہم حلقہ نے اصرار کیا اور ان سے شعر کہنے کی فرمائش کی تو انھوں نے اس کو ہرگز مایوس نہیں کیا۔

ظہیر صاحب فقط ایک محقق اور نقاد ہی نہیں بلکہ ایک صاحب ذوق فن کار بھی تھے۔ان کا یہ فن نعمتِ خداداد ہے ان کی داخلی دنیا اور ان کے بیرونی خیالات کا عکاس بھی۔ ایسا ہنر مادری زبان کی طرح زمان و مکاں کی قید سے پاک ہوتا ہے۔ چنانچہ نتیجہ یہی سامنے آیا کہ ظہیر صاحب کو اپنی شاعری کے آغاز کا خود بھی علم نہیں کہ انھوں نے اسے کب کہاں اور کیوں شروع کیا۔ ہاں انہیں اتنا ضرور معلوم ہے کہ انھیں اپنے خاندانی ماحول سے یہ اثر ملا اور جو کچھ کہا اپنے ذوق اور اپنے شوق کی تسکین کے لئے کہا۔ آپ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ شعر و سخن گھر کے ماحول میں رچا بسا ہوا تھا۔ انکے والد ضیاء احمد ضیاء تایا رضی احمد رضی اور چچا آفتاب احمد جو ہر سب کے سب شاعر تھے اس سخن پرور ماحول کے پروردہ ظہیر صاحب کا تعلیمی سلسلہ شروع ہوا تو وہاں بھی انھیں ایسے سخن شناس اور سخن پرور استاد میسر آئے جو شاعری کا اعلیٰ مذاق رکھتے تھے۔ ان پر ان اساتذہ کا بڑا اثر پڑا۔ یونیورسٹی میں رشید احمد صدیقی صاحب پروفیسر مسعود حسین خان صاحب، جذبی صاحب اور خورشید الاسلام صاحب جیسے نامور اساتذہ ملے انھوں نے ان کے علمی، شعری ذوق کو جلا بخشی۔

ظہیر صاحب نے غزل، نظم اور قطعات وغیرہ کئی اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے لیکن وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اور غزل ہی کو دوسری اصناف میں ممتاز حیثیت دیتے ہیں گو انہوں نے متعدد نظمیں بھی لکھی ہیں جو ارباب سخن سے داد و تحسین لے چکی ہیں۔ نظریاتی اعتبار سے وہ ادب اور زندگی کی صالح اقدار کے قائل ہیں۔ شاعری میں شعریت کو لازمہ قرار دیتے ہیں مگر اس میں پروپیگنڈے کے قائل نہیں۔ ان کا خیال ہے کہ شاعری میں محض تغزل اور زبان دانی کافی نہیں ہے۔ اس میں شعریت اور موضوع کا صحت مند امتزاج بھی ضروری ہے شاعری کے متعلق یہ خیالات اور نظریات انہیں اپنے اساتذہ کی تربیت سے حاصل ہوئے ہیں اور بقول خود انھیں ان نظریات و خیالات پر کوئی شرمندگی نہیں ہے۔

اصناف سخن کے مسلمہ میں وہ ماضی کے پابند ہیں اور حالی کے معتقد رہے ہیں۔ نظم میں وزن، شعریت، قافیہ، ردیف وغیرہ کو اس کے لازمی اجزا خیال کرتے ہیں۔ ساتھ

کہ میرا خاندان مسلمان تھا مگر جب شعور بیدار ہوا تو مجھ کو اپنی اس نسبت پر فخر محسوس ہونے لگا۔ میں خدا سے واقف نہیں تھا مگر جس برگزیدہ شخصیت نے خدا کے وجود کا اعلان کیا اس کے بارے میں جانتا تھا کہ اس کو دشمنوں نے بھی صادق اور امین تسلیم کیا۔ حضور اکرمؐ کی ذات مبارک میں مجھے وہ دل کشی نظر آئی جو کسی دوسری جگہ نظر نہیں آئی۔ میں سنّی صدیقی حنفی ہوں اور یہ میرا مسلک ہے۔ صحابۂ کرام کا احترام اور محبت اپنے ایمان کا جزو خیال کرتا ہوں۔ میرے بعض قریبی عزیزوں میں شیعہ مسلک کے لوگ تھے اس لئے شیعہ حضرات کے درمیان مجھے کبھی اجنبیت کا احساس نہیں ہوا۔ یہی سبب ہے کہ میرے خاندان میں شیعہ سنّی نزاع تو کیا کبھی بحث کا موضوع بھی نہیں بنا۔

ماقصہ سکندر و دارانہ خواندہ ایم از مابجز حکایت مہرو وفامپرس

لیکن علم نہیں کیوں وہابیت سے مجھے دلچسپی رہی ہے۔ وہابیوں کی شدت پسندی کو کبھی پسند نہیں کیا مگر یہ ضرور محسوس کیا کہ بہت سی بدعتوں کا سدباب اس مسلک کی وجہ سے ہوا ہے۔

میری تمام تر تعلیم علی گڑھ میں ہوئی۔ ابتدا سے لے کر یونیورسٹی تک میں نے علی گڑھ میں پڑھا۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے اردو (۱۹۵۳ء) اور فارسی (۱۹۵۹ء) میں ایم۔اے۔کیا۔ اس کے بعد جب دہلی آیا تو یہاں مومن۔ شخصیت اور فن پر مقالہ لکھ کر پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اسکول کے زمانے میں دو استادوں سے خاص طور پر متاثر رہا سید محمد ٹونکی صاحب مرحوم اور مولوی مفتی عبدالقیوم صاحب۔ اول الذکر انگریزی اور اردو پڑھاتے تھے اور موخر الذکر دینیات کا درس دیتے تھے۔ حق گوئی اور بے باکی ان دونوں کے مزاج کا حصہ تھی۔

یونیورسٹی میں پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب معین احسن جذبی صاحب۔ مسعود حسین خاں صاحب، محمد عزیر صاحب اردو کے اساتذہ تھے اور فارسی کا درس پروفیسر ہادی حسن صاحب اور والد مرحوم مولانا ضیاء احمد بدایونی سے لیا۔ ان تمام

ہی ان کا خیال ہے کہ تجربہ کرنا کوئی برا نہیں مگر ہٹ دھرمی بری چیز ہے۔ نظم معریٰ اور نثری نظم وغیرہ کے متعلق ان کا خیال ہے کہ آزاد شاعری سے اردو کا مزاج نہیں ملتا اس وجہ سے یہ مقبول صنف نہیں بن سکی۔

ظہیر صاحب کا خیال ہے کہ نظم معریٰ یا نثری نظم کے مقابلہ میں وہ بات زیادہ مؤثر ہوتی ہے جو شعری روایات کی پابندی کے ساتھ کہی جائے۔ اس بات کا ظہیر صاحب نے عملی تجربہ بھی کیا اور نمونہ پیش کر کے دکھایا۔

جیسا کہ ہم کہہ آئے ہیں ظہیر صاحب کی شاعری میں غزل کو ایک خاص حیثیت حاصل ہے۔ غزل اردو کی مقبول ترین صنف سخن ہے۔ رشید احمد صدیقی نے غزل کو اردو شاعری کی آبرو کہا ہے۔ ظہیر صاحب رشید احمد صدیقی کے اسی قول کے قائل اور معتقد ہیں۔ اور غزل کو دوسری اصناف پر فوقیت دیتے ہیں۔ سچ بھی یہی ہے کہ فی زمانہ اردو شاعری کا تصور غزل کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ ظہیر صاحب کا یہ خیال بھی بجا طور پر درست ہے کہ اقبال کی مقبول ترین نظمیں اسی وجہ سے نایاب شاہکار ہیں کہ ان میں رنگ تغزل نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ انہوں نے اپنی غزلوں میں اسی رنگ کو برقرار رکھا ہے۔ اور غزل کے روایتی انداز کو پسند فرمایا اور برتا ہے۔ غزل کی روایتی اصطلاحیں اور روایتی رنگ ہی ظہیر صاحب کی غزلوں کی جان ہے۔ خیالات کے لحاظ سے بھی وہ روایتی مفاہیم و معانی کو فوقیت دیتے ہیں۔ اور ساتھ ہی عصری رجحانات، موضوعات بھی ان کے یہاں موجود ہیں۔ انہوں نے غزل کے خلاف چلی ہوا کو ناپسند کیا ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ حالات حاضرہ سے بے خبر ہیں یا ان کی غزلوں میں ان کی عکاسی نہیں ہے۔ اس ضمن میں یہ بات بھی اہم ہے کہ ان کی غزلوں میں متصوفانہ افکار کا اظہار ان کی عشقیہ شاعری کے ساتھ ساتھ برابر نظر آتا ہے۔

بہت سی قدیم اور روایتی اصطلاحات آج بھی ہماری شاعری کی اساس ہیں۔ ظہیر صاحب نے اس نوع کی شعری اصطلاحوں سے اپنی غزل کو سجایا اور سنوارا ہے۔ ہمارے دعوے کے ثبوت میں ذیل کے اشعار کافی ہیں جن میں ان کے نظریہ فن پر بھی

روشنی پڑتی ہے۔

میرے گھر میں دھوپ خوشی کی آئے بھلا تو کیسے آئے
میرے گھر کا آنگن چھوٹا دریچے دیوار بلند

فن محدود نہیں ہے یارو رنگوں اور لکیروں میں
دل کے لہو کی آمیزش سے ہوتا ہے فن کار بلند

ہائے رے قسمت کی محرومی دریا سے بھی پیاسے آئے
اپنا دامن خالی خالی داتا کی سرکار بلند

اب ضروری ہے کہ گلشن میں نشیمن اپنا
آتشِ لالہ و گل سے بھی بچایا جائے

آج پھر بزم میں دستورِ زباں بندی ہے
ڈھونڈ کر پھر کسی منصور کو لایا جائے

ہم وفا کیش تھے کیوں ترک وفا کر بیٹھے
ان سوالات میں اچھا ہے نہ جایا جائے

منزل دوست اسی راہ سے پڑتی ہے قریب
آؤ راہ رسن و دار سے جایا جائے

خطا وار ازل کو دے دیا خلعت نیابت کا
سزا تقصیر کی یہ ہے تو پھر انعام کیا ہوگا

خرد نے کارنمایاں کئے بہت لیکن
جنوں کی دین ہے دنیا میں رسمِ دار و رسن

خلوص اہل وفا کو نہ آزمائے دل
جبیں پہ میرے رفیقوں کے آنہ جائے شکن

مذکورہ اشعار سے یہ تو بہر طور ظاہر ہے کہ ظہیر صاحب کی شاعری زندگی کی کلفتوں اور دکھوں کی بھی عکاسی کرتی ہے غم ایک نا قابل فراموش حقیقت ہے۔ جس سے کسی کو انکار نہیں۔ لیکن اسی رنج و غم کی راہ سے گزر کر جینا زندگی ہے محض قنوطی اور ناامید بن کر جینا شیوہ حیات نہیں ہے۔ تصوف کی تعلیم یہ ہے کہ انسان آلائش دنیا کو عبور کرنے کے لئے معرکہ آرا رہے حتیٰ کہ اسے آخری قربانی کے لئے بھی تیار رہنا چاہئے۔ اسی میں سچائی کی فتح اور باطل کی شکست ہے۔

ظہیر آپ اندھیروں سے جنگ بھی تو کریں
سحر نہ لائے گی یہ حسرتِ سحر تنہا

سرخی خون شہادت ہوئی شامل جب سے
پڑ گئی جان غم عشق کے افسانوں میں

لیکن یہ مزاج اور فاتحانہ جذبہ محض تعلیم سے مکمل نہ ہوگا۔ جب تک ان کی معقول تربیت نہ ہوگی زندگی کا یہ افضل ترین تصور ممکن نہ ہو سکے گا اقبال نے کہا تھا۔

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیل کو آداب فر زندی

ظہیر صاحب عقلیت پرستی کی ان درسگاہوں سے نالاں ہیں جس کے نتیجہ میں یہ باطنی دنیا زندگی کی صالح اقدار سے محروم رہ گئی ہے۔

یہ عہد حاضر کی درسگاہیں جو شیوہ بندگی سکھائیں
ہمارے افسردہ حوصلوں کو یہاں سے کیا روشنی ملے گی

کسے خبر تھی کہ ان کی محفل میں ہوگی یہ منزلت جنوں کی
خرد کے ہاتھ آئے گا نہ کچھ بھی جنوں کو پیغمبری ملے گی

ظہیر صاحب کے قلمی دیوان میں نظموں کی تعداد بھی کافی ہے۔ بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ ان کی نظمیں غزلوں سے زیادہ پرتاثر ہیں اس کی وجہ شاید یہی ہے کہ یہ نظمیں موقعہ محل اور وقت کے تقاضوں سے آشنا ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شدید قلبی احساسات ازخود صفحہ قرطاس پر نظم کی صورت میں اتر آئے ہیں۔ ان کی نمایاں نظموں میں ایک نظم ''ساقی نامہ'' ہے جس میں تمام ملکوں کی حالتِ زار پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اور پھر آخر میں وطن عزیز ہندوستان کی طرف رجوع کیا ہے۔ یہ اور اسی طرح کی دوسری نظمیں عالمی فکر اور عالمی سوچ کی حامل ہیں۔ ان میں ''نذر علیگڑھ'' ''سوویت روس کی چودھویں سالگرہ'' ''بارگاہِ خسروی میں'' ۔ ''نذر جوہر'' ۔ ''خواجہ معین الدین چشتی کی درگاہ میں'' ۔ اور ''ڈاکٹر ضیاء الدین کی تربت پر'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ بعض نظمیں ایسی بھی ہیں جو ذاتی نوعیت کی ہیں اور ان کی اپنی ذات سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان میں رنج اور خوشی دونوں طرح کی نظمیں شامل ہیں۔ ان میں بھی ظہیر صاحب کے جذبات کی سچی ترجمانی نظر آتی ہے۔ ظہیر صاحب کی بعض نظمیں تو اس قدر اثر آفریں ہیں کہ ان کے تمام کلام میں امتیازی حیثیت رکھتی ہیں۔

ان نظموں سے ظہیر صاحب کا ادبی و سماجی نظریہ بھی سامنے آتا ہے اور ان کے احساسات کی گرفت اور اظہار کی قوت کا بھی بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

ذاتی طور کی نظموں میں ایک نظم ''مکان نامہ'' نہایت لطیف اور دلچسپ ہے۔ حالات و واقعات کے علاوہ انداز شگفتہ اور دل پذیر ہے اور طنز کی لطیف نشتریت سے بھرپور ہے۔ اس کی شانِ نزول بتانے کی ضرورت نہیں شاعر کی پریشانی اور اس کے درد کو نظم خود ہی بیان کریں گے۔

علیگڑھ مسلم یونیورسٹی میں بدرالدین طیب جی کی وائس چانسلری کا زمانہ بہت اچھا مانا جاتا ہے۔ جب طیب جی سبکدوش ہوئے ان کے جانے کے بعد نئے وائس چانسلر صاحب کے زمانہ میں ایک فتنہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کو ظہیر صاحب نے اس تاریخی قطعہ میں

پیش کر دیا ہے۔

بدر چوں رد پوش شد بزم جہاں تیرہ گشت
آدمیاں گم شدند ملکِ خدا خرگرفت
از پئے تاریخ آن گفت دلِ نکتہ داں
شامت اعمالِ ما صورتِ یاور گرفت

۱۹۶۵

یہ قطعہ ذو معنویت کی بہترین مثال ہے۔ یہاں بدر اور یاور کے ناموں سے بر محل شعری فائدہ اٹھایا گیا ہے۔

ظہیر صاحب کی ایک اور نظم ڈاکٹر ضیاء الدین کی تربت پر ہے۔ ظہیر صاحب کے ادبی رجحان اور خیالات کی غمازی کے ساتھ ساتھ اس نظم میں مادر درسگاہ سے ان کی الفت اور اس کا درد بھی نمایاں ہوتا ہے۔

سوگوار آیا ہوں میں با چشم تر آیا ہوں میں
آنسوؤں کے پھول لے کر قبر پر آیا ہوں میں

نالہ کش ہے گردش گردوں سے غمگین دل مرا
سعئ لاحاصل نظر آتا ہے اب حاصل مرا

شکوہ سنج انقلاب چرخِ نیلی فام ہوں
کامرانی جس سے چھن جائے میں وہ ناکام ہوں

رہتی دنیا تک ترے صدمے میں رونا ہے مجھے
آنسوؤں سے اپنے دامن کو بھگونا ہے مجھے

میری امیدوں کا گلشن ہوگیا تاراج حیف
تھی علی گڑھ کو ترے تیری ضرورت آج حیف

تسلیم غوری بدایونی،
بدایوں۔

پروفیسر ظہیر احمد صدیقی کی یاد میں

کلیات مومنؔ کے پروفیسر ضیاء احمد مرحوم جو مومنؔ دہلوی پر سند کا درجہ رکھتے تھے۔ ان کے نام سے کون سا اردو کا اہل قلم ناواقف ہوگا۔ پروفیسر ظہیر احمد صدیقی انہیں پروفیسر ضیاء احمد کے فرزند ارجمند تھے جن کا چراغ ہستی اپنی زندگی کی ۷۵ بسنت دیکھنے کے بعد ہمیشہ کے لئے گل ہو گیا۔ یعنی ۱۷ فروری ۲۰۰۳ء کو پروفیسر ظہیر احمد صدیقی علیگڑھ میں رحلت فرما گئے اور اسی روز بعد نماز ظہر بدایوں کا لاڈلہ اور اردو کا سپوت دفن کر دیا گیا۔ رہے نام اللہ کا۔

پروفیسر ظہیرؔ احمد صدیقی جسمانی طور پر ہمارے درمیان نہیں رہے مگر ان کا ادبی سرمایہ آج بھی ہمارے بیچ موجود ہے اور جب تک اردو کی شمع جلتی رہے گی اور اس کے جلانے والے باقی رہیں گے پروفیسر ظہیرؔ احمد صدیقی کا نام زندہ رہے گا موت سبھی کو آنا ہے خدا کی مرضی میں کس کو دخل ہے۔

پروفیسر ظہیرؔ احمد صدیقی نے اردو کے تین دبستانوں سے فیض حاصل کیا۔ دبستان بدایوں میں پیدا ہوئے اور پرورش پائی۔ دبستان علیگڑھ میں تعلیم حاصل کی اور دبستان دہلی میں رہ کر علم کے دریا بہائے اور اپنے والد کی طرز پر حکیم مومن خاں مومنؔ دہلوی کو اپنے قلم کی گرفت میں لے کر خود کو امر کر دیا۔ اس میں وہ لکھتے ہیں۔

''خوش قسمتی سے میرا تعلق تین علمی ادبی مرکزوں سے رہا ہے ۱۹۲۸ء میں مدینۃ الاولیاء بدایوں میں پیدا ہوا، آنکھ کھولی تو مذہب اور ادب کے چرچے تھے، حضرت مولوی رفیع احمد عالی میرے دادا پروفیسر ضیاء احمد میرے والد اور مولوی آفتاب احمد جوہر میرے چچا ہیں (تھے) ان بزرگوں کے سایہ میں میں نے پرورش پائی اس کے بعد علیگڑھ جیسی مردم خیز جگہ میں قیام اور تعلیم کا موقع ملا''۔

بدایوں میں آباد شیوخ خاندانوں میں ایک گھرانہ ظہیر احمد صدیقی کا بھی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس خاندان کے ایک بزرگ مولوی تاج الدین اٹھارہویں صدی کے آغاز میں اپنے خاندان کے افراد کے ساتھ علاقہ سنبھل، ضلع مرادآباد سے ترک سکونت کر کے بدایوں شہر میں آ کر آباد ہوئے۔ اس خاندان میں ہر دور میں صاحب علم و قلم پیدا ہوئے ہیں۔ مشہور زمانہ کتاب ''ہدایت المخلوق'' کے مصنف شیخ محمد افضل اسی خاندان کے فرد تھے۔ انکی نسل میں مولوی کمال احمد گزرے ہیں جن کی فارسی ادبیات اور خطاطی میں مہارت کے تذکرے آج بھی علمی حلقوں میں ہوتے ہیں۔ مولانا تاج الدین سے پروفیسر ظہیر احمد صدیقی کا سلسلہ اس طرح جا ملتا ہے۔

مولانا تاج الدین
↓
مولانا محمد افضل
↓
محمد اجمل
↓
کمال احمد

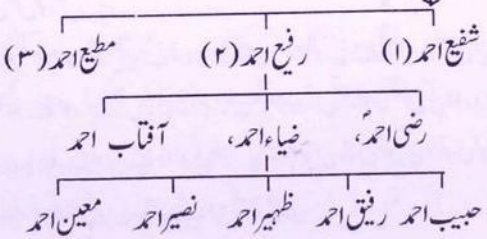

پروفیسر ظہیر احمد صدیقی کے اہل خاندان نے اردو شعر و ادب میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اس خاندان کے افراد پر اگر کوئی اردو کا جیالہ تحقیقی مقالہ لکھے تو یہ بڑے کام کی چیز ہوگا۔ غرض اس علمی اور ادبی اہمیت کے خاندان میں ظہیر احمد صدیقی نے ۱۰/ جولائی ۱۹۲۸ء کو بدایوں میں آنکھ کھولی۔ سرکاری کاغذات میں سنہ پیدائش ۱۹۲۹ء درج ہے جو غلط ہے۔ پروفیسر ظہیر احمد صدیقی نے جس عہد اور جس خاندان میں آنکھ کھولی وہاں ادبی ذوق کا طوطی بول رہا تھا ان کے اہل خاندان اور اہل وطن سبھی اردو فارسی شعر و ادب کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے، سونے پر سہاگہ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی نے ان کے ادبی ذوق کو نکھارنے میں اہم کردار ادا کیا پروفیسر ظہیر احمد صدیقی خود لکھتے ہیں۔ ''ہر شخص کی زندگی پر کچھ نہ کچھ ماحول کا اثر ضرور ہوتا ہے والد محترم اور علی گڑھ نے میری شخصیت کی تکمیل میں بہت بڑا رول ادا کیا، علی گڑھ یونیورسٹی میں مجھے پروفیسر رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر معین احسن جذبی ڈاکٹر مسعود حسین خان، ڈاکٹر محمد عزیر کی شاگردی کا شرف حاصل رہا، احسان فراموشی ہوگی اگر میں اپنے اسکول کے استادوں میں سید محمد ٹونکی صاحب اور مولوی عبدالقیوم صاحب کا ذکر نہ کروں ان دونوں نے ادبی تربیت کے ساتھ مزاج میں حق گوئی اور بے باکی پیدا کی''

پروفیسر ظہیر احمد صدیقی نے جب ادبی میدان میں قدم رکھا تو ان کو اپنے والد کی بنائی ہوئی ڈگر پر چلنا آسان نظر آیا اور انہوں نے حکیم مومن خاں مومن دہلوی جیسے عالمی شہرت یافتہ اردو شاعر کو اپنے ذوق کی تکمیل کے لئے آلۂ کار بنایا اور مومن شخصیت اور فن'' موضوع پر تحقیقی مقالہ سپرد قلم کیا جس پر ۱۹۶۱ء میں دہلی یونیورسٹی نے ان کو ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری عطا کی۔

حکیم مومن خاں مومن دہلوی کے علاوہ انہوں نے اپنے ہم وطن لاثانی شاعر حضرت شوکت علی خاں فانی پر بھی قلم اٹھایا اور ایک وطن دوست اور وطن پرست ادیب ہونے کا حق ادا کر دیا۔ ''فانی کی شاعری'' اور ''بچوں کے فانی'' فانی شناسی کی اہم کڑیاں ہیں۔ ان کے علاوہ انہوں نے فانی بدایونی کا کلام بھی تاریخ وار ترتیب دے کر ''کلیاتِ فانی'' نام سے شائع کر دیا۔ اس کے علاوہ ''مطالعہ انیس''، ''مطالعہ حالی'' اور ادب میں

جمالیاتی اقدار'' جیسی اہم کتب بھی ان کے قلم کی مرہون منت ہیں۔ جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ پروفیسر ظہیر پر کوئی ایک لیبل نہیں لگایا جا سکتا وہ اردو کی ہر ڈگر پر نظر رکھتے تھے۔ انہوں نے متفرق موضوعات پر تحقیقی اور تنقیدی مضامین بھی لکھے جو ہندوستان اور پاکستان کے معتبر رسالوں اور اخباروں میں شائع ہوئے۔ جن کو انہوں نے کتابی شکل میں ترتیب دے کر یکجا کر دیا اس طرح ''فکری زاوئے''، ''احساس وادراک'' جدید شاعری'' اور میزان قدر'' ان کے مضامین کے مجموعے وجود میں آ چکے ہیں۔

نثر کے ساتھ ساتھ نظم کے میدان کے بھی وہ شہوار تھے اور ہونا بھی چاہئے تھا کیونکہ انہوں نے جس خاندان میں ہوش سنبھالا وہاں فارسی اور اردو شاعری کا بول بالا تھا۔ ان کے گھر کا ہر فرد خواہ مرد ہو یا عورت شاعری کا پاکیزہ مذاق رکھتا تھا جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ اگر اردو کا کوئی اسکالر ظہیر صدیقی کے خاندان کو موضوع بنا کر تحقیقی مقالہ لکھے تو وہ یہ کام بہ آسانی کر سکتا ہے۔ ''خاندان کے شعراء'' پروفیسر ظہیر احمد صدیقی کا تحریر کردہ ایک اہم مضمون ہے۔

ہم پروفیسر ظہیر احمد صدیقی کو پیدائشی شاعر بھی کہہ سکتے ہیں۔ انہوں نے اپنے کلام پر کس استاد شاعر سے اصلاح لی خود ان کے الفاظ میں پڑھئے:

''شاعری میں برادر مکرم اظہر احمد کمالی اور برادرِ محترم میکش بدایونی نے رہنمائی کی''۔

مگر ظہیر صدیقی نے نثر کے مقابلے میں نظم پر خاص توجہ نہیں دی اگر وہ نثر کی طرح نظم پر بھی تھوڑا سا وقت صرف کر لیتے تو ان کے قلم سے بہت سے حسین شہہ پارے وجود میں آتے۔ اسی لئے انہوں نے جو کچھ بھی غزلیں یا نظمیں لکھیں وہ ان کے نثری کارناموں میں دب کر رہ گئیں۔ میں نے ان کا جتنا بھی کلام پڑھا ہے مجھے اس میں ایک سچے شاعر کی عمیق نظری کا احساس ہوتا ہے۔ ان کا کلام صاف اور سلجھا ہوا ہے۔ ایک زمانے میں دہلی میں ان کو مکان کی قلت محسوس ہوئی اس پس منظر میں انہوں نے ایک نظم کہی تھی جو بہت مقبول ہوئی اس کی مقبولیت کا اندازہ اسی بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ آج بھی لوگوں

کے حافظے میں محفوظ ہے حالانکہ یہ واقعاتی نظم تھی مگر اس کی جاذبیت اور اس کا حسن آج بھی ایک غزل کی طرح ہے۔

ان کی غزلوں کے چند اشعار آپ بھی پڑھ لیجئے۔

کوئی اب خارتلووں سے نکالے بھی تو کیا حاصل
بہت کانٹے تو پیوست رگ جاں ہو گئے ہونگے

ڈھونڈتا ہے آدمی ٹوٹے مکانوں میں پناہ
تم کو دہشت کا کھلے منظر کی اندازہ نہیں

شدت ِ احساس کا زنداں بھی ہے کتنا عجیب
اسمیں دیواریں ہی دیواریں ہیں دروازہ نہیں

☆

عروس زیست کی زلفیں سنوارنے کے لئے
اٹھا متاع عمل لے کے اک بشر تنہا

☆

ہماری دشت نوردی کی داد دے کوئی
بھری بہار میں چھوڑ آئے گھر کا گھر تنہا

☆

خطاوارِ ازل کو دے دیا خلعت نیابت کا
سزا تقصیر کی یہ ہے تو پھر انعام کیا ہوگا

ہمارے ملک کے تعلیمی اداروں کی موجودہ صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے انہوں نے اشارہ اس طرح کیا ہے:

یہ عہد حاضر کی درسگاہیں جو شیوۂ بندگی سکھائیں
ہمارے افسردہ حوصلوں کو یہاں سے کیا زندگی ملے گی

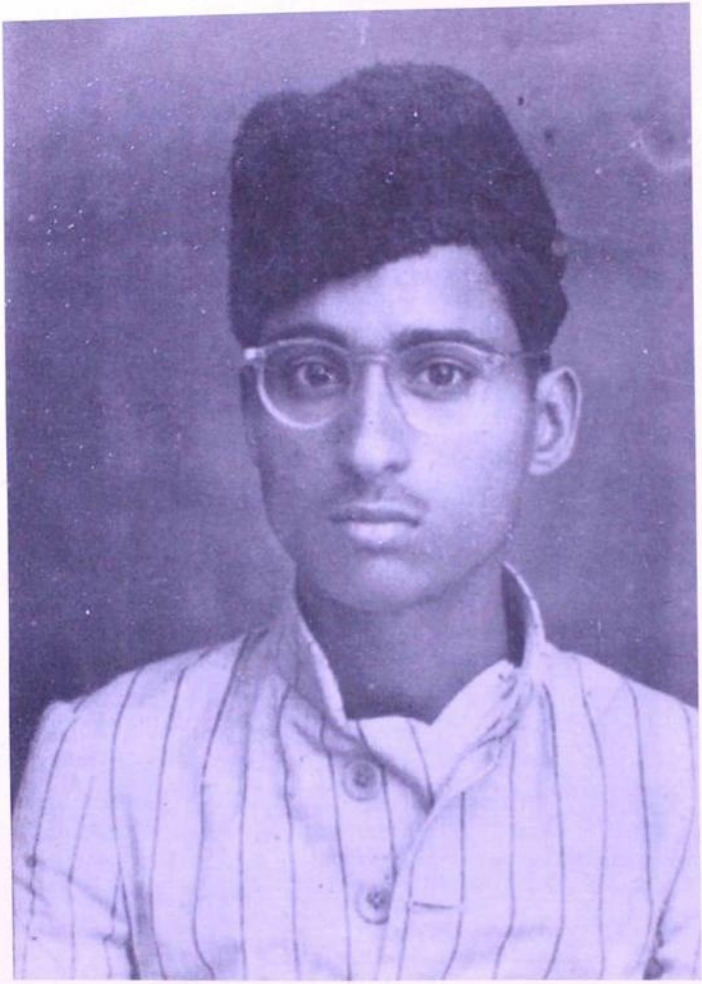

ظہیر احمدؒ صدیقی ۔ اسکول ۔ کلاس نہم

کسے خبر تھی کہ انکی محفل میں ہوگی یہ منزلت جنوں کی
خرد کے ہاتھ آئے گا نہ کچھ بھی جنوں کو پیغمبری ملے گی

دیکھا آپ نے پروفیسر ظہیر نے کیسے کیسے نگینے تراشے ہیں۔غزل کے علاوہ ''ساقی نامہ''، نذر علیگڑھ''، ''مکان نامہ''، ''روح حسرت کے نام''، ''خلیل الرحمن اعظمی کی یاد میں''، ڈاکٹر ضیاء الدین کی تربت پر'' اور غالب'' ان کی بڑی کامیاب پر اثر اور پر زور نظمیں ہیں۔

ہر آدمی اپنی زندگی میں کسی نہ کسی شئے یا شخصیت سے ضرور متاثر ہوتا ہے ویسے یہ مقولہ ہے کہ مرد کی ترقی کے پیچھے کسی عورت کا ہاتھ ضرور ہوتا ہے مگر چلیں پروفیسر ظہیر نے کس سے اثر قبول کیا اور کیوں کیا، ان کے قلم کی زبان سے ہی سنتے چلیں۔

''قیام دہلی کے زمانے میں جس شخص نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ خواجہ احمد فاروقی صاحب تھے انہوں نے دہلی میں اردو کی شمع اس وقت روشن کی جب لوگ اس کو بجھانے پر آمادہ تھے۔ میرے ادبی سفر میں پروفیسر ظفر احمد صدیقی، پروفیسر اختر اقبال کمالی پروفیسر صبیح احمد کمالی نے رہنمائی کی اور بیگم افتخار ظہیر نے اپنے تعاون اور مشوروں سے بہت سے مسائل کو سہل اور آسان بنا دیا''۔

پروفیسر ظہیر احمد صدیقی نہایت شریف اور سلجھے ہوئے مزاج کے انسان تھے، ان میں تکبر، انا اور غرور نام کو نہ تھا۔ منکسر المزاجی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ جب بھی ملتے خلوص سے ملتے، خندہ پیشانی سے ملتے، وہ شرافت اور نجابت کا پیکر تھے ان کا ذوق اور مزاج دونوں پاکیزہ تھے۔ میرے پاس ان کے تحریر کردہ درجنوں خطوط محفوظ ہیں جن میں خلوص پیار اور انس کی بھرمار ہے۔ ان کے خط ادبی حیثیت کے ہوتے تھے۔ جب کوئی مشورہ طلب کیا فوراً دیا۔ کسی کتاب کا حوالہ پوچھا فوراً لکھا کبھی ایسا نہیں ہوا کہ انھوں نے مجھے اپنی کوئی کتاب نہ بھیجی ہو یا میرے خط کا جواب نہ دیا ہو۔ ان کو اپنے وطن اور اہل وطن سے بہت محبت تھی اس کا اظہار اپنے ایک شعر میں اس طرح کیا ہے۔

یہ خاک پاک بداؤں کا فیض ہے کہ ظہیر
سخن وروں میں ہمار اشمار ہوتا ہے

پروفیسر ظہیر احمد صدیقی کا حافظہ بلا کا تھا اور یہ وصف ان کے خاندان کے ہر فرد میں پایا جاتا ہے مگر افسوس ان کے زبردست حافظے کو کسی کی نظر لگ گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کو ایک ایسی بیماری نے گھیر لیا جس سے ان کی یادداشت زائل ہونے لگی اور آخر کو ان کی موت کا سبب بنی۔

پروفیسر ظہیر احمد صدیقی اردو کے دلدادہ تھے۔ اردو کے علمبردار تھے اور ان کا اوڑھنا بچھونا اردو تھی۔ وہ اردو سے اتنی ہی محبت کرتے تھے جتنی ایک ماں اپنے بچے سے کرتی ہے یا بچہ ماں سے کرتا ہے۔ اردو کے متعلق ان کا کیا نظریہ تھا یہ بھی پڑھ لیجئے اور مرحوم کے حق میں مغفرت کی دعا کرتے ہوئے مجھے اجازت دیجئے۔

''ادب میں سب سے زیادہ مہلک چیز بے ادبی ہے اور یہ کبھی تعصب اور کبھی پروپگنڈہ سے پیدا ہوتی ہے۔ ادب میں صالح جمالیاتی اقدار کا ہونا بے حد ضروری ہے۔ مذہب اور ادب میں میں کبھی کسی ازم کا قائل نہیں ہوں، وہ لوگ جو اردو کے رسم الخط کو بدلنے کی بات کہتے ہیں ان کو اردو دشمن خیال کرتا ہوں۔ میرا یہ بھی عقیدہ ہے کہ جو لوگ اردو کے دشمن ہیں وہ اپنے ملک اور سماج کے کبھی وفادار نہیں ہو سکتے''۔

☆☆☆

رفیع الزماں زبیری
ہمدرد فاؤنڈیشن، ناظم اباد، کراچی

ظہیر.....میرا بچپن کا ساتھی

پروفیسر ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی۔ ایم اے، پی ایچ ڈی۔۔ میرے لئے صرف ظہیر ہیں۔ ہم بچپن کے ساتھی ہیں۔ ہم نے پہلی جماعت سے ساتھ پڑھا ہے۔ ہمارے شوق اور دل چسپیاں بھی ایک رہی ہیں اور ہمارا خوب وزشت کا معیار بھی ایک رہا ہے۔ بچپن کی دوستی کا رشتہ بہت مضبوط ہوتا ہے اور طبیعتوں کا میل اور فکر کی ہم آہنگی اسے دوام بخشتی ہے۔

مجھے یاد نہیں ظہیر سے میری پہلی ملاقات کب ہوئی تھی۔ نصف صدی کے لگ بھگ زمانہ گزر گیا۔ مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے ہم ہمیشہ سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ وقت کو اس دوستی سے کوئی نسبت نہیں۔ ہاں ابتدائی ملاقات کی ایک بات ضرور یاد ہے۔ والد صاحب کے انتقال کے بعد میں جب تعلیم کی غرض سے علی گڑھ آیا تو بہت چھوٹا تھا۔ پہلی کلاس میں تو انھوں نے اپنی زندگی ہی میں داخل کر دیا تھا لیکن چند ماہ کے بعد وہ بیمار ہو گئے اور مجھے ان کے ساتھ وطن واپس جانا پڑا۔ پھر جب وہ مجھے ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر اس دنیا سے چلے گئے تو میں دوبارہ علی گڑھ آیا اور دوسری کلاس سے میری باقاعدہ پڑھائی شروع ہوئی۔ ہمارا اسکول یونیورسٹی اسکول کہلاتا تھا اور اس کا جونیئر سیکشن جو چوتھی کلاس تک تھا، اس وقت چھوٹے بچوں کے ہوسٹل، ظہور وارڈ کے ایک حصے میں قائم تھا۔ ایک انگریز مسٹر جی۔ سی۔ وڈ ہمارے اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ ایک دن میں دوڑتا ہوا کلاس میں آیا تو ایک

کھلے ڈسک سے ٹکرایا اور میرے ہونٹ پر چوٹ لگی۔ تھوڑا خون بھی نکل آیا۔ تکلیف سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور قریب تھا کہ میں باقاعدہ رونے لگتا کہ میری ہی عمر کا ایک لڑکا میرے پاس آیا اور مجھے تسلی دینے لگا پھر اپنی ناک کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا: ''یہ دیکھو، میرے بھی تو چوٹ لگی تھی۔ مگر میں نے تو ذرا پرواہ نہ کی''۔ میں نے آنسو بھری آنکھوں سے اس کی ناک کی طرف دیکھا۔ چوٹ کا نشان تھا۔ ''کیا ہوا تھا؟'' میں نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ''ایک دیو سے مقابلہ ہو گیا تھا۔ اس نے تلوار چلائی تو میری ناک پر لگی۔ میں نے جواب میں اس کے ایک ڈنڈا مارا۔ دیو کا سر پھٹ گیا۔'' دیو سے مقابلہ! میں حیرت سے اس لڑکے کو دیکھنے لگا اور اپنی چوٹ بھول گیا۔ شاید یہیں سے ہماری دوستی کی ابتدا ہوئی ہو۔

ظہیر اور ہم اسی طرح ساتھ پڑھتے رہے۔ ایک جماعت سے دوسری جماعت میں آتے گئے۔ پھر جونیئر اسکول سے سینیر اسکول میں آ گئے جو منٹو سرکل کی عمارت میں تھا۔ یہ ایک خوب صورت سی عمارت تھی۔ یہ اسکول بھی تھا اور طلبا کا ہوسٹل بھی۔ ہم یونیورسٹی کمپلکس میں رہتے تھے۔ ظہیر کے والد یونیورسٹی میں فارسی کے استاد تھے۔ وہ فارسی ادب اور شاعری کے اتنے بڑے عالم تھے کہ ان کے پایہ کے شاید چند ہی عالم برصغیر میں ہوں گے، میں اپنے تایا کے پاس رہتا تھا وہ شعبۂ جغرافیہ میں استاد تھے۔ میرا گھر ظہور وارڈ کے تو بالکل سامنے تھا جہاں چوتھی جماعت تک کا جونیر اسکول تھا، منٹو سرکل دور تھا۔ چھٹی ہونے پر ہم اور ظہیر ایک ساتھ اسکول سے نکلتے۔ ایک وسیع میدان سے گزرتے جو ہمارے اسکول کا پلے گراؤنڈ تھا اور پھر سڑک پار کر کے ایک اور بہت بڑے میدان میں آتے۔ جہاں یہ میدان ختم ہوتا وہاں سے ہمارے راستے جدا ہو جاتے۔ ہم راستے بھر باتیں کرتے جاتے۔ کبھی کبھی ہمارا بخت یاوری کرتا تو اپنے محترم استاد سید محمد ٹونکی کا ساتھ ہو جاتا۔

ٹونکی صاحب بڑے لائق بڑے بااصول اور شفیق استاد تھے لیکن طبیعت سیمابی پائی تھی۔ ہمیں انگریزی اور تاریخ پڑھاتے تھے۔ کبھی کبھی اردو کی کلاس بھی لے لیتے تھے۔ اقبال اور سوشلزم کے پرستار تھے۔ نیشنلسٹ خیالات کے حامل، کھدر کی سفید ٹوپی، کھدر کی

شیروانی اور کھدر کا کرتا اور پاجامہ۔ چھوٹا سا قد مگر بڑی بارعب شخصیت۔ ظہیر ان کے خاص شاگرد تھے۔ اگرچہ مجھ پر بھی ان کی نظر خاص تھی لیکن جو مرتبہ ظہیر کو ان کی بارگاہ میں حاصل تھا وہ مجھے نہیں تھا۔ اس میں ایک حصہ ظہیر کے صاحب علم والد مولوی ضیا احمد صدیقی بدایونی سے ٹونکی صاحب کی عقیدت کا تھا۔ ایک ٹونکی صاحب کیا ظہیر کو سب ہی استادوں سے گریس مارکس اسی حوالے سے ملتے تھے۔ مزمل صاحب ہمیں اردو پڑھاتے تھے۔ اس وقت تو ہم کیا سمجھتے ہاں اب سمجھ میں آتا ہے کہ وہ درس و تدریس کے معاملے میں اپنی کمزوری کس طرح چھپاتے تھے۔ کلاس میں اردو پڑھاتے وقت جب کوئی مشکل شعر آجاتا تو ظہیر کی طرف دیکھتے اور جیسے خود بھاری بھرکم تھے ویسی ہی بھاری بھرکم آواز میں کہتے: ''ظہیر! تم بتاؤ اس شعر کا مطلب'' پھر اس سے پہلے کہ ظہیر فاتحانہ انداز میں کھڑے ہوں اور شعر کا مطلب بتائیں، کلاس سے مخاطب ہو کر کہتے:

''جانتے ہو! ظہیر کے والد بڑے لائق آدمی ہیں۔'' پھر ظہیر شعر کا مطلب بتاتے۔ اگر وہ غلط بھی ہوتا تب بھی مزمل صاحب اپنے چوڑے چکلے ہاتھ اٹھا کر یوں داد دیتے: ''دیکھا، کتنا صحیح مطلب بتایا ہے۔ بس۔ اب اسے یاد کرلو۔''

یہاں ایک واقعہ یاد آ گیا۔ ایک مرتبہ ظہیر نے جب وہ علی گڑھ یونیورسٹی میگزین کے ایڈیٹر تھے اور یہ بھی ایک بڑا اعزاز اور اعترافِ اہلیت تھا مولانا عبدالماجد دریابادی سے میگزین کے لئے ایک مضمون کی فرمائش کی اور اپنے قبلہ والد صاحب سے بھی دو حرف سفارش کے لکھوا دیے۔ مولانا نے مضمون کی فرمائش کو قبول کرتے ہوئے ظہیر کو یہ شعر لکھ بھیجا:

لو تبسم بھی شریکِ نگہ ناز ہوا

آج کچھ اور بڑھا دی گئی قیمت میری

تو تعلیم کے ابتدائی دور ہی سے ظہیر کو ایک علمی گھرانے سے وابستگی کے باعث احترام حاصل ہو گیا تھا اور خود ان پر اس احترام کا برقرار رکھنا ایک بڑی ذمہ داری بن گیا تھا۔ ظہیر نے اس ذمہ داری کو کیسا نباہا ہے، اس سے اہل علم خوب واقف ہیں۔ انھوں نے اردو

ادب اور شاعری میں بحیثیت ایک ادیب نقاد اور استاد کے جو مقام حاصل کیا ہے اس کا تعین تو ان کے ہم عصر اور بعد کو آنے والے کریں گے میں تو ظہیر کو ایک سچے دوست اور بچپن کے ساتھی کی حیثیت سے جانتا ہوں۔ اگر چہ ان کی علمیت کا رعب بھی مجھ پر کچھ کم نہیں ہے۔

علی گڑھ میں ظہیر سے میری رفاقت کا زمانہ کچھ زیادہ طویل نہ تھا۔ مشکل سے دس سال۔ ان ہی دس سالوں میں ہم نے بچپن سے لڑکپن میں اور پھر جوانی کی حدود میں قدم رکھا۔ میں ۱۹۴۶ء میں میٹرک کر کے علیگڑھ سے دہلی آ گیا۔ اگلے سال ستمبر میں دہلی سے کراچی آ گیا۔ دس سال کی اس مدت کے ابتدائی چار پانچ سال کی یادیں تو اب بہت کچھ دھندلا چکی ہیں۔ یہ زمانہ تو بس کھیل کود میں گزر جاتا ہے۔ اگر چہ میری زندگی کے یہ ابتدائی سال بھی دکھ میں گزرے۔ محبت کرنے والا باپ دنیا سے چلا گیا تھا اور تعلیم کی خاطر اس سے زیادہ چاہنے والی ماں سے بھی دور ہو گیا تھا۔ پھر چند سال بعد وہ بھی ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر چلی گئیں۔ تنہائی اور دو ایسی محبتوں سے محرومی نے جن کا کوئی نعم البدل نہیں ہوا کرتا میرے بچپن کو افسردہ کر دیا تھا۔ ایسے میں ظہیر کی رفاقت میرے لئے زخم پر پھایہ بن گئی تھی۔ میرے اور ظہیر کے مشغلے اور دل چسپیاں ایک ہی جیسی تھیں۔ انھیں بھی کھیل سے بس اس قدر دل چسپی تھی کہ آس پاس کے ہم عمر لڑکوں کے ساتھ چھٹی کے دن گھر کے سامنے میدان میں کرکٹ کھیل لیں یا گلی ڈنڈا۔ گھر سے باہر نکلنے کا موقع نہ ہوا تو کیرم بورڈ کھیل لیا یا کبھی تاش۔ تاش عموماً ہمارے گھروں میں نہیں کھیلے جاتے تھے۔ شرطیں باندھ کر کھیلنے کا تو کوئی سوال ہی نہ تھا یوں ہی تفریح کے طور پر کھیلنے کو بھی برا سمجھا جاتا تھا۔ مغرب کے وقت گھر واپس آ جانا لازمی تھا۔ اس میں کوئی رعایت نہ کی جاتی تھی۔ ہاں امتحان کے دنوں میں پڑھنے کے لئے ہم جماعت دوست کسی ایک ساتھی کے ہاں جمع ہو جاتے تھے۔

جب ہم دسویں کلاس میں آئے تو میں اسکول میگزین کا ایڈیٹر مقرر ہوا۔ ظہیر بھی میرے ساتھ ایڈیٹوریل بورڈ پر تھے۔ اسی سال ہم نے ''نور سحر'' کے نام سے ایک پندرہ روزہ پرچہ خود نکالا۔ یہ ایک چودرقہ تھا جس میں ادب، شاعری اور اسکول کی خبریں سب ہی کچھ ہوتا تھا۔ افسوس کہ اس کی عمر بہت تھوڑی ہوئی۔ ٹونکی صاحب ہمارے اسکول کی وسیع

لائبریری کے سرپرست بھی تھے۔ وہ ہمیں لائبریری میں دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ اسکول میں وقفے کے دوران ہم لائبریری چلے جاتے۔ ظہیر کے ہاں تو کتابوں کی کمی نہ تھی۔ ان کے والد کی اپنی ذاتی لائبریری کا کیا کہنا۔ ان کی تو ساری زندگی کتابوں ہی کے درمیان گزری، پڑھنے پڑھانے میں، لکھنے لکھانے میں، ہمارے تائے ابّا کے ہاں جو باپ کی موت کے بعد میری پناہ گاہ تھی، کسی کو کتابوں سے دل چسپی نہ تھی۔ بس وہی کتابیں تھیں جو اسکول کے بستے میں ہوتی تھیں۔

ٹونکی صاحب نے ہمیں ادب اور شاعری کی طرف راغب کیا اور مولانا عبدالقیوم صاحب نے جو ہمیں اسلامیات پڑھاتے تھے دین کو سمجھنے کی صلاحیت عطا کی۔ مولانا عبدالقیوم صاحب بڑے شفیق استاد تھے۔ ان کا پڑھانے کا انداز ان کی شخصیت کی طرح دل آویز تھا۔ وہ عربی کے استاد بھی تھے۔ میں اور ظہیر کبھی کبھی ان کی عربی کی کلاس میں جا کر بیٹھ جاتے جس کی ہمیں خصوصی اجازت تھی۔ عربی سے محبت یہیں سے شروع ہوئی۔ عبدالقیوم صاحب ہم دونوں سے اور صابر سے بہت شفقت فرماتے تھے۔ صابر علی خاں نے جو ہماری ''چار کی ٹولی'' کے تیسرے رکن تھے عربی اختیاری مضمون کے طور پر لی ہوئی تھی۔ اسی طرح حنیف صاحب جغرافیہ کے استاد تھے، اصغر علی صاحب انگریزی پڑھاتے تھے اور عالم بخش صاحب ریاضی کے استاد تھے وہ ایک چھوٹا سا ڈنڈا اپنے کوٹ کی اندر کی جیب میں رکھتے تھے جو مارنے سے زیادہ ڈرانے کے کام آتا تھا۔ یہ سب ہمارے بڑے مہربان اور لائق استاد تھے۔ ہم پر ان سب کی خاص شفقت تھی۔ یہ ان کا سکھایا ہوا علم اور ان کی دی ہوئی تربیت ہے جس نے ہمیں آدمی سے انسان بنایا۔

صبح سے دوپہر تک کا وقت اسکول میں گزرتا۔ شام ہوتی تو میں ظہیر کے ہاں چلا جاتا۔ ان کا گھر میرے گھر سے دور تھا مگر اتنا بھی نہیں کہ پیدل آجا نہ سکیں۔ سردیاں ہوتیں تو کمرے میں اور موسم گرم ہوتا تو ان کے مکان کے باہر کے صحن میں مونڈھوں پر ہماری نشست جمتی۔ عارف افضل، صابر علی خاں اور فہیم الدین ہمارے ہم جماعت اور دوست تھے۔ بس یہی ہمارا حلقہ تھا۔ صابر اور فہیم تو قریب ہی رہتے تھے۔ عارف ذرا دور تھے۔ دو

تین گھنٹے یہاں باتیں ہوتیں اور پھر ہم اپنے اپنے گھروں کو سدھارتے۔ ظہیر مجھے چھوڑنے آتے اور کبھی تو ایسا بھی ہوتا کہ وہ میرے گھر تک آجاتے۔ پھر میں اصرار کرتا کہ اب انھیں ان کے گھر تک چھوڑ کر آنے کی میری باری ہے۔ وہ مجھے بس آدھے راستے تک آنے کی اجازت دیتے۔ آفتاب ہوسٹل کے دروازے پر ہم دونوں ایک دوسرے کو خدا حافظ کہتے۔

علیگڑھ کے اس دور میں ظہیر کی سب سے زیادہ گہری دوستی مجھ ہی سے تھی۔ وہ میری کوئی بات نہیں ٹالتے تھے۔

ظہیر کی پرخلوص اور محبت بھری دوستی نے ایک بار مجھے ایک ایسا قدم اٹھانے سے روک دیا جو اگر اٹھ جاتا تو میری زندگی کی راہیں بدل جاتیں اور میں نہ جانے کہاں بھٹکتا پھرتا۔

علیگڑھ میں قیام کا آخری سال میرے لئے بڑا تکلیف دہ اور صبر آزما تھا۔ مختلف گھریلو معاملات نے میرے ذہنی سکون کو تہہ و بالا کر دیا تھا۔ محرومیوں کا احساس یونہی کیا کم تھا کہ پے در پے ایسے ناخوشگوار واقعات ہوئے جنھوں نے مجھے ہلا ڈالا۔ لڑکپن کا دور اگرچہ ختم ہو رہا تھا لیکن ذہنی طور پر وہی ناپختگی تھی جو ان دنوں میں عموماً ہوتی ہے۔ ایک رات میں عشاء کے وقت ظہیر کے پاس پہنچا۔ اس وقت عموماً ہم اکھٹے بیٹھ کر پڑھتے تھے۔ عارف افضل بھی آجاتے تھے۔ لیکن اس رات میں پڑھنے کے لئے ظہیر کے پاس نہیں گیا تھا۔ ان سے رخصت ہونے کے لئے گیا تھا۔ کوئی ایسی بات ہوئی تھی کہ میرے لئے اب علیگڑھ میں رہنا ممکن نہیں نظر آرہا تھا۔ میں بہت اداس اور الجھا ہوا تھا۔ تنہائی کے احساس نے مجھ میں اپنی دلی کیفیت کو چھپانے کی عادت پیدا کر دی تھی۔ میں اپنے دکھ اور خوشی میں کسی کو شریک نہ کرتا تھا کیوں کہ اسے سمجھنے والا میرا کوئی بھی نہ تھا۔ میں ظہیر کے ہاں پہنچا۔ باہر صحن میں مونڈھے پڑے تھے۔ ظہیر اور افضل بیٹھے میرا انتظار کر رہے تھے۔ میں ان سے مل کر ایک مونڈھے پر خاموش بیٹھ گیا۔ چند ہی لمحوں میں ظہیر نے اندازہ کر لیا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔

''فیروز! کیا بات ہے؟'' فیروز میرا گھر کا نام تھا اور میرے بہت قریبی دوست مجھے اسی نام

سے پکارتے تھے۔ ظہیر کے لہجے میں کچھ ایسی محبت اور اپنائیت تھی کہ میں بے اختیار رو پڑا۔ دل میں امنڈتے ہوئے طوفان کے آگے جو بند دیر سے باندھا ہوا تھا، وہ ٹوٹ گیا۔ میں نے انھیں بتایا کہ میں علیگڑھ سے جا رہا ہوں اور ان سے رخصت ہونے آیا ہوں۔ میں نے کہا، چلو میرے ساتھ ریلوے اسٹیشن۔ ظہیر کچھ کہے سنے بغیر فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔ خاموش میرے ساتھ چلتے رہے۔ راستے میں نقوی پارک پڑتا تھا جب وہاں پہنچے تو بولے کہ آؤ کچھ دیر یہاں بیٹھ جائیں۔ پھر وہ مجھے لے کر فوارے کے قریب ایک بینچ پر جا بیٹھے اور باتیں کرنے لگے۔ اب تک ایک بار بھی انھوں نے میرے فیصلے کی راہ میں حائل ہونے کی کوشش نہیں کی تھی لیکن جب کافی دیر گزر گئی اور انھوں نے محسوس کیا کہ میری غصے اور جھنجھلاہٹ کی کیفیت کم ہو گئی ہے تو انھوں نے ایک مخلص اور ہمدرد دوست کی حیثیت سے مجھے سمجھانا شروع کیا اور بالآخر رات گئے وہ مجھے اپنے ساتھ واپس لانے میں کامیاب ہو گئے۔ انھوں نے مجھے ایک غلط فیصلے پر عمل کرنے اور اس کے نتیجے میں ہونے والی پریشانیوں سے بچا لیا۔

اسی طرح جب علیگڑھ میں میرے چھوٹے بھائی کی رہائش کا مسئلہ پیدا ہوا تو انھوں نے یہ ذمہ داری اٹھالی اور ایک بھائی کی طرح اقبال کا خیال رکھا۔

میں جون ۱۹۴۶ء میں علیگڑھ سے دہلی آ گیا تھا۔ میرے حالات ایسے تھے کہ میٹرک کے بعد فوری طور پر تعلیم کا سلسلہ جاری رکھنا ممکن نہ تھا۔ دہلی آ کر میں نے صحافت کو اپنایا اور اپنی آئندہ زندگی کے لئے ایک راہ متعین کر لی۔ اگست ۱۹۴۷ء میں جب آزادی کی صبح ہوئی اور اس کے جلو میں دیوانگی کی ایک لمبی تاریک رات آئی جب ہی میں کراچی آ گیا اور نئے وطن میں نئی زندگی شروع کی۔ جدوجہد کی زندگی۔ تعلیم کا سلسلہ بھی جہاں سے ٹوٹا تھا وہاں سے پھر شروع کیا۔ ظہیر علی گڑھ میں تھے۔ ملک کی تقسیم نے جمے جمائے نقشے کو بری طرح بگاڑ دیا تھا۔ ساری اچھی قدریں عصبیتوں کے پاؤں تلے روندی گئی تھیں۔ آگ اور خون کا کھیل کھیلا جا رہا تھا۔ بارے صورت حال میں تبدیلی آنی شروع ہوئی۔ زندگی کے معمولات پھر شروع ہو گئے۔ خیال تھا کہ ایک دو سال میں دونوں ملکوں کے درمیان معمول کے تعلقات پھر قائم ہو جائیں گے لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ پاکستان سے پڑوس میں ہندوستان

جانا اور وہاں سے یہاں آنا امریکا آنے جانے سے زیادہ مشکل ہو گیا۔ ظہیر نے اپنے فطری رجحان اور خاندانی روایت کے مطابق علی گڑھ میں علمی مدارج طے کرنے کے بعد درس و تدریس کو اپنی زندگی کا محور بنایا اور ادب کی دنیا میں اپنا مقام بنانا شروع کر دیا۔

فانی اور مومن دو شاعروں سے ظہیر کو شروع ہی سے دل چسپی تھی۔ فانی ان کے ہم وطن تھے، بدایوں کے رہنے والے تھے۔ اسکول میں ہمارے ایک دوست کا تو یہ حال تھا کہ جب بھی وہ ظہیر سے ملتے، ان سے یہ سوال ضرور کرتے: ''فانی کے کلام میں غم کیوں ہے؟ بتایئے!'' مومن سے دل چسپی کا سبب یہ تھا کہ ان کے قبلہ والد صاحب کو اس شاعر سے خاص لگاؤ تھا۔ اگر مجھے صحیح یاد ہے تو ظہیر نے مومن کی شاعری پر ہی تھیسس لکھا ہے پھر ان کی شادی بھی ایک ایسی لڑکی سے ہوئی جو ان کی طرح علم کی جویا تھی اور جس نے ان ہی کی طرح درس و تدریس کا پیشہ اختیار کیا۔

تقسیم ہند کے بعد ظہیر سے پورے سات سال تک ملاقات نہیں ہوئی۔ پھر ایک دن اچانک وہ کراچی میں میرے گھر پہنچ گئے اور چند ہفتے جو وہ یہاں رہے تو وہی علی گڑھ کے دن واپس آ گئے۔ اگرچہ ہم ایک دوسرے سے جدا ہو گئے تھے لیکن ذہنی رفاقت ختم نہیں ہوئی تھی۔ خط و کتابت کا سلسلہ بھی اگرچہ زندگی کی مصروفیات نے بند کرا دیا لیکن دوستی میں کوئی فرق نہ آیا۔ طویل عرصے تک ایک دوسرے سے نہ ملنے کے باوجود جدائی کا کبھی احساس نہیں ہوا۔ ہم دونوں ظاہری طور پر بہت بدل چکے ہیں، زندگی کے سفر کی علامتیں ہمارے دونوں کے چہروں سے عیاں ہیں۔ لیکن جب بھی ہم ایک دوسرے سے ملتے تھے ہماری دنیا وہی ہوتی تھی۔ وہی بچپن کی دنیا۔ ہمارے بچے بڑے ہو گئے، ان کے بھی بچے ہو گئے لیکن ہمارے لئے شاید وقت ٹھہر گیا تھا۔ ہم جب بھی ملتے تو یہی لگتا جیسے وہی اسکول کا زمانہ ہے اور ہم اسی طرح ایک دوسرے سے مل رہے ہیں جیسے علی گڑھ میں ملا کرتے تھے۔ وہی بے لوث محبت، وہی بے غرض دوستی۔

☆☆☆

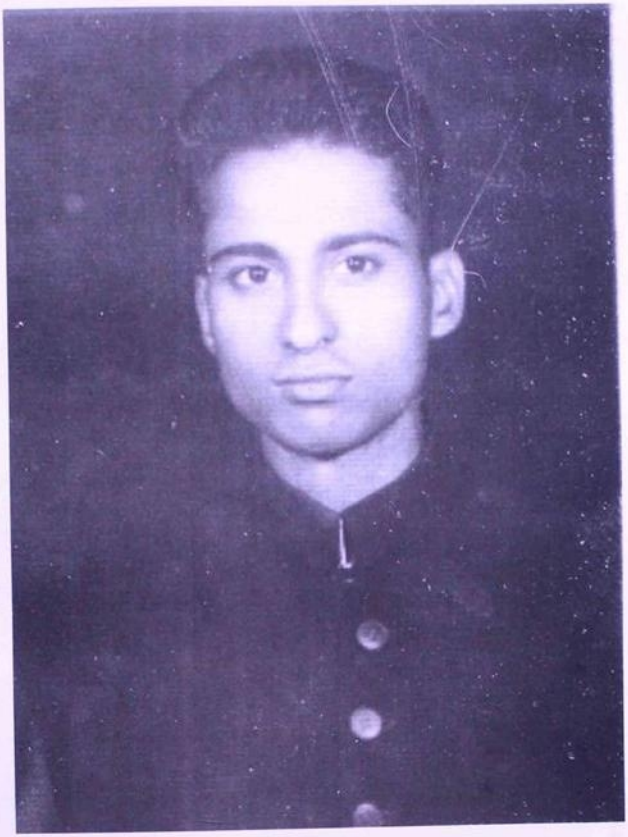

ظہیر احمدؒ صدیقی یونیورسٹی ۔ بی ۔اے

ڈاکٹر اسلم فرخی
شعبہ اردو، کراچی یونیورسٹی

ظہیر احمد صدیقی ..... کچھ یادیں کچھ باتیں

جہاں تک یاد پڑتا ہے مغیث الدین فریدی نے تعارف کرایا تھا۔ ہوا یہ کہ میں حضرت سلطان جی کے عرس میں شرکت کرنے کے لیے دلی گیا ہوا تھا۔ عرس کی تقریب میں مغیث نے ایک صاحب سے تعارف کرایا۔ ''یہ حضرت سلطان جی سے وطنی نسبت رکھتے ہیں۔''، ''تو پھر میرے لیے محترم ہیں'' ایک اور نسبت بھی ہے۔ ''یہ مولانا ضیا احمد بدایونی کے صاحبزادے ہیں۔'' مولانا ضیا احمد بدایونی فارسی کے وہ بزرگ فاضل تھے جو علی گڑھ میں ''خلیج فارس کے گھڑیال'' کی حیثیت سے مشہور تھے۔ اُن کی فضیلت علمی کا اندازہ اس امر سے ہوسکتا ہے کہ مرشدی و مولائی حضرت اُستاذی، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں قبلہ مولانا کی شاگردی پر فخر فرماتے ہیں اور اُنھیں فارسی کے بڑے عالموں میں شمار کرتے ہیں میں نے بارہا ڈاکٹر صاحب قبلہ کی زبانی مولانا کی فضیلت علمی اور تبحر کے تذکرے سنے ہیں۔ تعارف میں اسی نسبت سے اور زیادہ گرویدگی پیدا ہوئی۔ مغیث نے نام بتایا۔ ''ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی دلی یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر ہیں۔ ہم یہاں انھیں کے سایے تلے آباد ہیں۔ بے تکلف اور منکسر المزاج آدمی نظر آئے۔ ادعائے علم سے بڑوں بڑوں کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں لیکن ان کے یہاں نہ ادعائے علم تھا نہ کسی قسم کی

تمکنت ۔ بڑی گرم جوشی سے ملے اور اس طرح ملے کہ مغیث کی طرح میں بھی اُنھیں ظہیر بھائی کہنے پر مجبور ہو گیا۔

ظہیر بھائی ، متوسط قد ، گندمی رنگ ، روشن آنکھوں ، چوڑی پیشانی ، نازک دہانے ، باریک ہونٹوں اور گول چہرے کے ہنستے مسکراتے انسان تھے ۔ دلی میں رہتے تھے مگر بدایوں کی چھاپ بہت گہری تھی ۔ دور سے متوسط طبقے کے زمیندار نظر آتے تھے ۔ پہلی ہی ملاقات میں ہم لوگ ایک گوشے میں بیٹھ گئے اور بڑی یادگار باتیں ہوئیں ۔ مغیث کی معصومانہ شوخی اور مسکراہٹ ، ظہیر بھائی کی بے تکلفی اور بذلہ سنجی ، اس ملاقات میں یہ بھی طے پایا کہ اگلے دن دلی یونیورسٹی کی شعبہ اردو میں محمد حسین آزاد کے حوالے سے میرا ایک لیکچر ہوگا۔ انھوں نے وعدہ کیا کہ یونیورسٹی کے کوئی طالب علم مجھے لینے اسکاوٹ کیمپ آئیں گے اور میری رہ نمائی کریں گے ۔ چنانچہ دوسرے دن حسبِ وعدہ ایک نوجوان مجھے لینے آ گئے ۔

میں ان کے ساتھ گاڑی میں روانہ ہوا۔ راستے میں بات چیت ہونے لگی ۔ دوران گفتگو میں نے دریافت کیا۔ ''وطن مالوف'' انہوں نے کسی قدر جھینپتے اور شرماتے ہوئے کہا۔ ''ایک غیر معروف ضلع ہے فرخ آباد۔ وہاں کے ایک موضع مچھ پور وا سے تعلق ہے ۔'' میں نے کہا۔ تو پھر نواب زمان ، آصف زمان اور انصاف زماں سے بھی تعلق ہوگا'' کہنے لگے ''دیہات میں رشتے داریاں تو ہوتی ہی ہیں'' پھر میں نے کہا۔ ''مچھ پور وا سے متصل قصبہ صمدن ہے ۔ مولوی اقبال احمد صمدانی تاریخ الٰہ آباد کے مؤلف کا وطن اور قریب ہی تالگرام ہے ۔ مرزا نعیم اللہ بیگ رُسوا کا وطن'' ۔ وہ یہ سب سنتے رہے اور اچھنبے میں مبتلا رہے ۔ آخر میں ، میں نے اُن سے پوچھا ۔ ''آپ نے میٹرک کہاں سے کیا ہے ۔ بولے ۔ ''کمال گنج کے فیروز گاندھی ہائی اسکول سے'' میں نے کہا ۔ ''اوہو ۔ بھائی محمد علی اور علی شیر کے قائم کیے ہوئے اسکول سے'' اب تو وہ بالکل ہی حق حیران نظر آنے

لگے گھبرا کر بولے ''آپ کو یہ سب باتیں کیسے معلوم حیرت ہے'' آپ نے میرے نام کے آخری جز پر غور نہیں کیا'' اُچھل پڑے۔ بولے۔ ''اوہو۔ اوہو فرخ آبادی کا مخفف ہے کیا خوب۔ مگر آپ کی معلومات حیرت انگیز ہیں'' شعبے پہنچ کر میں نے یہ واقعہ ظہیر بھائی کو سنایا اور کہا۔ ''داد دیتا ہوں آپ کی تلاش کی۔ رہ نما بھیجا تو ایسا جس سے آپ کی سی خوشبوئے اُنسیت آ رہی ہے۔ ''ظہیر بھائی ہنسے اور کہنے لگے۔ مجھے بھی علم نہیں تھا کہ حضرت کہاں کے رہنے والے ہیں۔ پھر کچھ سوچ کر بولے۔ ''آپ تو حضرت سلطان جی کے مہمان ہیں۔ یہ دل پذیر رہ نمائی بھی بزرگانہ شفقت اور مہمان نوازی کا حصہ ہے'' جب میں یونیورسٹی سے واپس ہو۔ تو اُن صاحب نے کہا میں آپ کو واپس چھوڑنے بھی چلوں گا'' میں نے کہا۔ ضرور چلئے۔ میں ایک فرخ آبادی سے ملنے جا رہا ہوں۔ غلام ربانی تاباں سے کبھی ملاقات ہوئی ہے۔ کہنے لگے۔ اچھا وہ بھی فرخ آباد کے ہیں۔ پھر تو میں ضرور چلوں گا۔ ہم لوگ جامعہ نگر پہنچے تو ربانی صاحب انتظار میں گھر کے باہر ٹہل رہے تھے۔

ظہیر بھائی نے لیکچر ہی کا اہتمام نہیں کیا بلکہ میری مصروفیت اور وقت کی قلت کے باوجود کھانا کھلانے پر اصرار کیا۔ کھانے میں چند لوگ شریک تھے۔ ہمارے یہاں کی طرح کا بے حد مرغن، پُر تکلف اور بھاری کھانا نہیں تھا۔ سادہ اور مزے دار کھانا۔ وہ جو ہم لوگوں میں لہا لینے کی عادت ہے کہ یہ بھی ہو۔ وہ بھی ہو اس قسم کا کوئی مظاہرہ نہیں تھا۔ مجھے حضرت سلطان جی کے عرس میں سولہ مرتبہ شرکت کی سعادت حاصل ہوئی۔ جب بھی گیا۔ احباب کے یہاں جانے اور کھانے کا اتفاق ہوا۔ جو بات میں نے خاص طور پر محسوس کی یہ تھی کہ اہل علم حضرات کا رہن سہن سادہ اور کسی قدر قدیم انداز کا حامل تھا بیشتر گھروں میں دسترخوان بچھتا تھا اور گھر کا ساز و سامان معمولی تھا۔ یہ ایک بندھے ٹکے اور مضبوط معاشرے کی نمود تھی۔ ظہیر بھائی کا رہن سہن بھی جدید سے زیادہ قدیم انداز کا حامل تھا۔ گھر کی ہر چیز سے سلیقہ، صفائی اور مناسب نگہداشت کا اظہار ہو رہا تھا۔ کھانے

کے دوران ظہیر بھائی علمی اور ادبی پھلجھڑیاں چھوڑتے رہے ہم لوگ لطف طعام کے ساتھ لطف کلام سے بھی محظوظ ہوتے رہے اسی کھانے میں افتخار بھابھی سے بھی ملاقات ہوئی (ڈاکٹر افتخار بیگم) بھابھی افتخار ذاکر حسین کالج میں اردو کی استاد تھیں۔ کئی تحقیقی کتابوں کی مولف تھیں۔ گھر داری کے سلیقے کے ساتھ ساتھ تالیفی سلیقے کی بھی حامل تھیں۔ تھیں کیا معنیٰ، ہیں۔ قدرے خاموش، بردبار اور تین گفتگو میں شریک رہیں لیکن کم کم پھلجھڑیاں ظہیر بھائی ہی چھوڑتے رہے۔ مغیث نے اپنی طبع شاعرانہ کے باوجود توجہ کھانے پر مرکوز کی اور دوسروں کی سنتے رہے خود نہیں بولے۔ بڑی پُر لطف صحبت رہی آخر میں یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ ظہیر بھائی ترپھلے کے دلدادہ ہیں۔ یعنی اصطبل خاص میں سائیکل بھی موجود ہے موٹر سائیکل بھی حاضر ہے اور موٹر بھی کھڑی ہاتھی کی طرح جھوم رہی ہے۔ وہ گاہے گاہے حسبِ ہمت اور مطابقت وقت کے ساتھ ساتھ ان سب سے استفادہ کرتے رہتے ہیں مگر انہوں نے مجھے سائیکل اور موٹر سائیکل پر چھوڑنے کی پیش کش نہیں کی۔ سیدھے سبھاؤ موٹر نکالی اور جائے قیام پر پہنچا دیا۔ چلتے وقت کتابوں کا ایک پیکٹ بھی ساتھ کیا۔ کہنے لگے۔ ''درویش کے گھر سے خالی ہاتھ نہیں جاتے۔'' میں نے جواب میں کہا۔ ''پیٹ بھرا ہو تو ہاتھ خالی رہنے میں کوئی حرج نہیں ہوتا۔''

اگرچہ یہ ملاقاتیں مختصر تھیں لیکن یادگار تھیں۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ ایک بہت اچھے انسان سے ملاقات ہوئی ہے۔ ظہیر بھائی بڑے سینیر اُستاد تھے۔ عرس کی تقریب میں میں نے یہ دیکھا کہ دلی کے بہت سے اساتذہ ان کے شاگرد تھے۔ ان کے ساتھ بڑے ادب آداب سے پیش آرہے تھے مگر (ظہیر بھائی میں اپنے سینیئر ہونے کا کوئی افتخار اساتذہ اُن کے شاگرد تھے ان کے ساتھ بڑے ادب آداب سے پیش آرہے تھے) مگر ظہیر بھائی میں نے اپنے سیئر ہونے کا کوئی افتخار نہیں تھا۔ میں نے ملاقاتوں میں یہ بھی محسوس کیا کہ وہ دل زندہ اور دیدہ بیدار کے حامل ہیں۔ مخلص ہیں، ہمدرد ہیں، رکھ رکھاؤ کے آدمی ہیں وضع دار ہیں کسی پر رُعب نہیں گانٹھتے۔ لکھنے پڑھنے میں وقت

گزارتے ہیں محنتی ہیں اور ادب کا صحیح ذوق رکھتے ہیں ان کے ادبی ذوق کی تعمیر میں ان کے خاندانی پس منظر کا بھی حصہ تھا ان کے اہل خاندان میں علم ادب اور شعر کے معروف نام ملتے ہیں تاہم انہوں نے اپنا رستہ خود نکالا روایت سے استفادہ کیا اور جدت پسندی کی راہ اختیار کی۔ وہ یونیورسٹی کے تدریس اور غیر تدریسی حلقوں میں بھی مقبول تھے وجہ ان کی سادگی اور فطری بے تکلفی تھی۔ ہر ایک سے کھلے دل سے ملتے تھے اور ہر ایک کے کام آتے تھے۔

یہ دونوں ملاقاتیں جاگنے کا ایک خواب تھیں رات گئی بات گئی۔ میں کراچی واپس آ گیا لیکن ظہیر بھائی کے بارے میں ایک خوش گوار تاثر کے ساتھ..... زمانِ گزراں نے اس تاثر پر غفلت اور فراموش کاری کی کوئی تہہ نہیں چڑھائی۔

ایک دن صبح دس بجے گیٹ کی گھنٹی بجی۔ اُٹھ کر گیا تو دیکھا ظہیر بھائی کھڑے ہیں۔ نہ کوئی اطلاع۔ نہ کوئی خط، بس چلے آ رہے ہیں۔ انہیں دیکھ کر مرزا فرحت اللہ بیگ کا وہ تاریخی جملہ یاد آ گیا کہ جب وہ پہلے پہلے حیدر آباد دکن گئے اور اپنے والد صاحب کے ساتھ سر بلند جنگ کے یہاں پہنچے جو ان کے رشتے کے بھائی بھی تھے اور بہنوئی بھی۔ تو سر بلند جنگ انھیں دیکھ کر حیران رہ گئے کہ یہ آدمی ایک ہی دفعہ میں حیدر آباد کیسے آ گیا'' مجھے بھی یہی حیرانی ہوئی کہ ظہیر بھائی ایک ہی دفعہ میں دلی سے کراچی کیسے پہنچ گئے۔ حیرانی اس لیے بھی ہوئی کہ وہ کسی رہ نمائی اور مدد کے بغیر میرے یہاں کیسے پہنچے پتہ ڈھونڈنے میں تو بہت سے دوستوں کو بھی دقت ہوتی ہے۔ احمد ہمدانی بارہا چکر لگا کر ناکام لوٹ گئے۔ ظہیر بھائی نے راستہ پوچھا نہ مکان کی جائے وقوع بس سیدھے آ گئے۔ پھر مجھے خیال آیا کہ یہ اس دیار خوش انوار سے تعلق رکھتے ہیں۔ جہاں سے خلق خدا کو ہدایت و رہ نمائی ملتی ہے ان کو رہ نمائی کی کیا ضرورت ہے۔ معلوم یہ ہوا کہ وہ یونیورسٹی کی چھٹیوں میں کراچی کا پھیرا کرتے ہیں۔ کتابوں کا ایک بنڈل ساتھ تھا جو وہ میرے لیے لائے تھے۔

کراچی میں ظہیر بھائی کا قیام کوئی پندرہ بیس دن رہا۔ ہر دوسرے تیسرے دن میرے یہاں آتے تھے بڑا اچھا وقت گزرا۔ یونیورسٹی میں سب سے ملے۔ شعبہ اردو میں ان کے اعزاز میں جلسہ ہوا۔ یونیورسٹی میں ان کے اور دوست بھی تھے۔ پھر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب قبلہ کی قدم بوسی کے لیے حیدرآباد گئے۔ ڈاکٹر صاحب قبلہ کا یہ حال تھا کہ ان کی پذیرائی میں بچھے جا رہے تھے۔ ''محترم استاد زادے'' کی تکرار فرماتے رہے بڑی تواضع کی۔ غیر معمولی مسرت کا اظہار فرمایا۔ ظہیر بھائی کی یہ کیفیت کہ شرمندہ شرمندہ..... اُدھر سے اظہار کرم۔ ادھر سے اظہار ممنونیت۔ بڑا راحت بخش سماں تھا۔ اس روز ڈاکٹر صاحب قبلہ کی عظمت کردار اور ظہیر بھائی کی عقیدت مندی کو حاضرین نے پوری طرح محسوس کیا۔ ایسے روح پرور مناظر کم دیکھنے میں آتے ہیں۔

پھر یہ ہوا کہ ظہیر بھائی جس طرح اچانک آئے تھے اسی طرح اچانک چلے گئے۔ اچانک یوں کہ جانے کا دن تاریخ سب معلوم تھی لیکن یہ یقین نہیں تھا کہ وہ اس طرح چلے جائیں گے۔ ان کی بے تکلفی اور یہاں کے ماحول میں ڈھل جانے کی فطری صلاحیت سے ہمیشہ یہ محسوس ہوتا تھا کہ جیسے وہ یہاں سے کبھی نہیں جائیں گے۔ میں نے کھانے پر بلایا تو خود وقت مقررہ پہنچ گئے۔ نہ یہ نخرہ کہ مجھے لینے کون آئے۔ رات زیادہ ہو جائے۔ چھوڑنے کا

کیا انتظام ہوگا، ہر چند کہ پہنچانے کا انتظام تھا مگر وہ واپسی کا انتظام کر کے آئے تھے۔ یار شاطر تھے، بار خاطر نہیں تھے۔

میں ہر سال عرس میں شرکت کی سعادت حاصل کرنے دلی جاتا رہا۔ ظہیر بھائی سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ وہ اور مغیث دونوں مغرب کے وقت وہاں موجود ہوتے۔ ہم وہاں سے اُٹھ کر خواجہ حسن ثانی نظامی کے یہاں جا بیٹھتے۔ باتوں کا سلسلہ جو شروع ہوتا تو وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوتا۔ کراچی کے ایک ایک جاننے والے کی خیریت

پوچھتے۔ ڈاکٹر صاحب قبلہ کی صحت کے بارے میں دریافت کرتے۔ مغیث کی طرف دیکھتے اور مسکراتے ہوئے کہتے۔ ''فریدی صاحب۔ اس سال ہم اور آپ دونوں کراچی چلیں۔'' مغیث اس وار کو خاموشی سے سہ جاتے کیونکہ وہ سفر کے نام ہی سے گھبراتے تھے۔ پھر اُنھیں یہ بھی احساس تھا کہ انہیں طرح طرح کے امراض نے گھیر رکھا ہے ظہیر بھائی ہر چند ان کی ڈھارس بندھاتے لیکن ان کی تشفی نہ ہوتی۔ گائے کا گردہ تھے بیچارے۔ ظہیر بھائی کو ان کے ساتھ بہت خلوص تھا۔ حد یہ ہے کہ ایک دفعہ کراچی میں ظہیر بھائی کو لطف اللہ خاں صاحب کے آواز خانے میں جانے کا اتفاق ہوا۔ یہ آواز خانہ پاکستان کے زندہ عجائبات میں سے ہے۔ ان سے دریافت کیا گیا کہ آپ کس شاعر کی آواز سننا پسند کریں گے۔ ظہیر بھائی نے ایک لمحے کچھ سوچا اور پھر کہا۔ فریدی صاحب کی آواز۔ بہت ممکن ہے ان کے دل میں یہ خیال آیا ہو کہ بھلا مغیث الدین فریدی جیسے گوشہ گیر اور عزلت پسند شاعر کی آواز یہاں کیا محفوظ ہوگی لطف اللہ خاں صاحب نے برقیاتی اشارے میں کچھ دیکھا اور پھر ظہیر بھائی کو مغیث کا کلام انھیں کی زبان سنوا دیا۔ بڑے حیران ہوئے۔ میرا خیال ہے کہ انہوں نے مغیث کا کلام سننے کی فرمائش بر بنائے خلوص کی تھی۔ وہ ہر معاملے میں مغیث کی رائے کو اہمیت دیتے تھے اور بڑی محبت سے انہیں فریدی صاحب کہتے تھے۔

آخری دفعہ وہ کراچی آئے تو افتخار بھابھی کی آنکھ کا آپریشن ہوا۔ کہنے لگے۔ ''بیٹی یہاں ہے مناسب دیکھ بھال ہو جائے گی حالانکہ آج کل موتیا کا آپریشن بہت آسان ہو گیا ہے پھر بھی دیکھ بھال ضروری ہے۔'' مسجد بیت المکرّم کے نزدیک ڈاکٹر شہزادے کے عین الشفا میں آپریشن ہوا۔ صبح دس بجے کا وقت قرار پایا تھا۔ میں دس بجے ایک گلدستہ لیے ہسپتال پہنچا تو ظہیر احمد بھائی باہر بیٹھے تھے۔ اکیلے تھے۔ میں جا کر ان کے پاس بیٹھ گیا۔ بڑے خوش ہوئے کہنے لگے۔ آپ نے کیوں تکلیف کی۔ آپریشن ہو

رہا ہے۔'' اتنے میں بھابھی باہر آئیں۔ ظہیر بھائی انھیں لے کر کمرے کی طرف چلے گئے ۔ذرا دیر میں، اپس آئے لیکن میں نے بیٹھنا مناسب نہیں سمجھا۔ اجازت لے کر چلا آیا۔ آپریشن کامیاب ہوا اور کچھ دن بعد ظہیر بھائی اور بھابھی دونوں خوش خوش میرے یہاں کھانے پر آئے۔ آپریشن کے دوران میں نے یہ دیکھا کہ ظہیر بھائی کے چہرے پر کسی قسم کی پریشانی کے آثار نہیں تھے۔ بالکل مطمئن بیٹھے تھے۔ عام زندگی میں بھی وہ اسی طرح مطمئن نظر آتے تھے۔

ظہیر بھائی دلی یونیورسٹی سے ریٹائر ہوگئے مگر انہوں نے دلی یا بدایوں میں اقامت اختیار نہیں کی۔ علی گڑھ میں مکان بنوالیا تھا۔ وہیں رہنے لگے۔ لکھتے، پڑھتے رہے۔ خط لکھنے کے معاملے میں بڑے مستعد تھے۔ فوراً جواب دیتے تھے اور خود بھی اپنی خیریت لکھتے رہتے تھے۔

میں نے اسی زمانے میں پی ایچ ڈی کے ایک مقالے کی جانچ کے لیے ان کا نام تجویز کیا جو یونیورسٹی نے منظور کرلیا مقالہ انہیں بھیج دیا گیا، لیکن مجھے اطلاع ملی کہ ظہیر بھائی بہت بیمار ہیں۔ بیماری کے باوجود انہوں نے پورا مقالہ بڑی توجہ سے پڑھا اور رپورٹ لکھ کر بھیج دی۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ ظہیر بھائی کو مقالہ دیکھنے میں غیر معمولی کاوش کرنا پڑی۔ اگر وہ چاہتے تو مقالہ واپس کردیتے لیکن انہون نے ایک دوست کی دلداری کو مدنظر رکھا خود تکلیف اٹھائی اور جلد سے جلد کام کردیا..... اسی بیماری میں رخصت ہوگئے جانے کیا جلدی تھی..... بس مایوس ہوگئے تھے حالانکہ ساری زندگی طمانیت کا پیکر بنے رہے۔ لیکن آخر آخر میں بالکل مایوس ہوگئے'' ایسے گئے کہ سب کو مایوس کرگئے وہ۔''

ظہیر بھائی بڑے محنتی آدمی تھے۔ لکھنے، پڑھنے سے بڑا شغف تھا۔ علمی کام بہت کیا ہے اور بہت اچھا کیا۔ مزاج تحقیقی تھا۔ فارسی بہت اچھی جانتے تھے۔ مطالعہ مومن میں

اختصاص حاصل تھا۔ اس ضمن میں خواجہ میر درد پر کام کیا تھا۔ ایک چھوٹی سی کتاب اس موضوع پر بچوں کے لیے بھی لکھی تھی۔ فانی ان کے ہم وطن تھے۔ فانی کی شاعری پر بھی ایک کتاب لکھی تھی اور بچوں کے لیے بھی فانی پر ایک کتاب لکھی تھی۔ متعدد کتابوں کو مرتب کیا تھا۔ مضامین کے متعدد مجموعے شائع ہوئے تھے۔ قدیم و جدید دونوں پر یکساں حاوی تھے۔ جدید شاعری پر بھی کتاب ہے اور خواجہ میر درد اور مومن پر بھی کتابیں مومن کے ناقدین ڈاکٹر عبادت بریلوی اور کلب علی خاں فائق کے حوالے سے ان کا تحقیقی مضمون عالمانہ اور فکر انگیز ہے۔ اسی طرح معاصرین مومن، مفتی صدرالدین آزردہ اور امام بخش صہبائی کے بارے میں بھی ان کے مضامین بڑے اہم ہیں ایک بہت مشہور شعر بہادر شاہ ظفر کے نام سے منسوب ہے۔

''عمر دراز، مانگ کے لائی تھی چار دن

دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں''

ظہیر بھائی نے تحقیق سے ثابت کیا کہ یہ شعر بہادر ظفر کا نہیں سیماب اکبرآبادی کا ہے۔ ان کی تحقیق سے یہ غلط فہمی دور ہوئی۔ علمی اور ادبی کام تسلسل اور تواتر سے کرتے رہتے تھے۔ اس میں ان کے خاندانی مزاج کا بھی بڑا دخل تھا۔ مجھے یہاں ان کی علمی کاوشوں پر کوئی تبصرہ نہیں کرنا۔ صرف ایک مضمون کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں جو میری رائے میں اپنے گہرے تاثر، انسانی مطالعے اور تاریخی اہمیت کی وجہ سے باوقار حیثیت کا حامل ہے۔ یہ مضمون ایک طرح سے مولانا ابوالکلام آزاد کا خاکہ ہے۔ باتیں ایسی ہیں جو ہم سب کی سنی ہوئی ہیں لیکن ان سنی ہوئی باتوں کو ظہیر بھائی نے مرتب کر کے تاریخ نگاری کا حق ادا کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

''ملک آزاد ہو گیا۔ قتل و خوں ریزی کا بازار گرم تھا۔ ہراس اور عدم تحفظ کا احساس ہر مسلمان کے دل و دماغ میں بیٹھ گیا تھا۔ گھر سے باہر نکلنا موت کو دعوت دینا

تھا۔ قافلوں کے قافلے اسٹیشن پر خانہ بدوشوں کی طرح پڑے ہوئے تھے اور ان کو یہ بھی یقین نہیں تھا کہ جس منزل کی طرف جا رہے ہیں وہاں پہنچ بھی جائیں گے تو اس نئی منزل پر ان کے ساتھ کیا سلوک ہوگا۔ دلی کی گلی کوچوں میں خاک اڑ رہی تھی۔ لوگ سمٹ کر پرانے قلعہ میں پناہ گزین تھے۔ اچانک جامع مسجد کے منبر سے ایک آواز بلند ہوئی۔

(یہ امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کی آواز تھی)

''تمہیں یاد ہے میں نے تمہیں یہیں سے پکارا اور تم نے میری زبان کاٹ لی۔ میں نے قلم اٹھایا اور تم نے میرے ہاتھ قلم کر دیے۔ میں نے چلنا چاہا تم نے میرے پاؤں کاٹ دیے۔ میں نے کروٹ لینا چاہی تم نے میری کمر توڑ دی۔ حتیٰ کہ پچھلے سات سال کی تلخ نوا سیاست، جو تمہیں داغ جدائی دے گئی اس کے عہد شباب میں بھی میں نے تمہیں خطرے کی ہر شاہ راہ پر جھنجھوڑا لیکن تم نے میری صدا سے نہ صرف اعراض کیا بلکہ غفلت و انکار کی ساری سنتیں تازہ کر دیں۔ نتیجہ معلوم کہ آج ان ہی خطروں نے تمہیں گھیر لیا ہے جن کا اندیشہ صراط مستقیم سے دور لے گیا تھا۔..... تم دیکھ رہے ہو کہ جن سہاروں پر تمہارا بھروسہ تھا وہ تمہیں لاوارث سمجھ کر تقدیر کے حوالے کر گئے ہیں۔ وہ تقدیر جو تمہارے دماغی لغت میں مشیت کی منشا سے مختلف مفہوم رکھتی ہے۔ یعنی تمہارے نزدیک فقدان ہمت کا نام تقدیر ہے'' سنا ہے کہ مولانا تقریر کر رہے تھے اور لوگوں کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ بوڑھوں کی داڑھیاں تر ہو گئی تھیں اور نوجوانوں کی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں۔

تاریخ نے اپنا ورق پلٹا اور مولانا آزاد علی گڑھ کے کانووکیشن میں ایڈریس پڑھنے کے لیے آئے۔ بڑے سے پنڈال میں اساتذہ اور جلسہ کا ہجوم تھا۔ ذاکر صاحب وائس چانسلر تھے۔ میں بھی ایک گوشہ میں بیٹھا بڑے غور سے مولانا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مولانا ڈائس پر آئے اور ولولہ خیز تقریر کا آغاز کیا۔ تقریر کے الفاظ تو یاد نہیں البتہ کچھ اس

ظہیر احمد صدیقی ۔ اپنے استاد پروفیسر رشید صدیقی کے ساتھ

انداز کی تقریر کر رہے تھے کہ:

''پاکستان کے نعرہ نے تم کو پاگل بنا دیا تھا۔ ایک بھیڑ چال تھی جس میں بغیر کسی مقصد اور نصب العین کے آگے بھاگے جا رہے تھے۔ ترقی کے وہ دروازے جن کو تمہارے لیے کھلا ہونا چاہئے تھے ان کو تم نے اپنے اعمال سے بند کر دیا۔ مگر مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے اپنے اندر تبدیلی پیدا کر لو ترقی کے وہ دروازے خود بخود کھل جائیں گے۔''

مولانا نے مزید کہا کہ:

''مجھ کو سرسید کی پالیسی سے ہمیشہ اختلاف رہا اور جب پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو محسوس کرتا ہوں کہ مجھے شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ میری رائے درست تھی۔''

اساتذہ اور طلبہ پر اس تقریر کا کوئی خوشگوار اثر نہیں پڑا۔ مگر طلبہ جس احساس کمتری سے اس وقت دوچار تھے اس میں سر جھکا کر سن لینے کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ شام کو طلبہ نے یونین میں مولانا آزاد کو مدعو کیا۔ یونین ہال میں مہمان کے استقبال کا منظر بڑا دلکش ہوتا ہے۔ ڈائس پر جہاں مہمان کی کرسی ہوتی ہی، وہاں ان کے پہنچتے ہی پھولوں کی بارش سے ان کو نہلا دیا جاتا ہے۔ صدر یونین شاہ حسن عطا نے تقریر کا آغاز کیا۔

''ایک مفسر قرآن نے صحیح کہا تھا کہ سیاست کے ریلے نے ہم کو پاگل بنا دیا تھا۔ ہم اندھے ہو رہے تھے اور ایک بھیڑ چال تھی جس کا کوئی مقصد نہیں، منزل نہیں۔ مگر مولانا کو شاید علم نہیں کہ ہم نے اس وقت سواد اعظم کا ساتھ دیا تھا۔ جس کے لیے ہم کو قرآن نے حکم دیا ہے۔ آج جب ہم پیچھے کی طرف دیکھتے ہیں تو ہم کو اپنے کیے پر کوئی شرمندگی نہیں ہوتی۔ البتہ اب حالات بدل چکے ہیں۔ فرد کی وفاداری کوئی معنی نہیں رکھتی۔ وفاداری ملک سے ہوا کرتی ہے ہم اس کے وفادار ہیں اور ہم نے اپنا مستقبل اسی

سے وابستہ کر دیا ہے۔''

لوگ حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ ذاکر صاحب کی چہرہ سے بے چینی کے آثار نمایاں تھے۔ مولانا آزاد کے چہرے کا رنگ غصہ سے سرخ ہو رہا تھا معلوم نہیں کون سا آتش فشاں پھوٹ بہے۔ شاہ حسن عطا نے تقریر ختم کی اور مولانا لپک کر آگے بڑھے اور جلسے سے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔ ''مجھے یہ خیال تھا کہ آپ لوگ مجھ سے سنیں گے مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ مجھے سننا پڑے گا میں جن ترقی کے دروازوں کو کھلا دیکھ رہا تھا اب وہ تمہاری قسمت میں نہیں ہیں۔ وہ دروازے بند ہو چکے ہیں''۔ مہمان اور میزبان دونوں ایک دوسرے سے مکدر اور مایوس۔

اقتباس قدرے طویل ۔۔ لیکن اس سے ظہیر بھائی کی قوت مشاہدہ۔ یادداشت اور تاریخ کے ایک نازک و نادر لمحے کی اہمیت و معنویت کا احساس اُبھرتا ہے۔ جرات اظہار کا کمال سامنے آتا ہے۔ سچائی کی قوت، اظہار کی قدرت و بیان کی ندرت، کیا کچھ نہیں ہے۔ بیان کتنا سادہ سچا اور پُر اثر ہے۔ شاہ حسن عطا پاکستان آ گئے تھے۔ ریڈیو پاکستان کراچی سے وابستہ تھے۔ میں نے اُنہیں ریڈیو میں ایک رفیق کی حیثیت سے بارہا دیکھا۔ سچے اور کھرے انسان تھے سیرت نبوی ﷺ پر ان کی تقریریں سنیں۔ میں نے کیا۔ سارے پاکستان نے سنیں کیونکہ وہ ٹی وی میں بھی سیرت پر تقریر کرتے تھے، کیا جوش تھا، کیا جذبہ تھا کیا طلاقت لسانی تھی، کیا علمی تبحر تھا۔ اب نہ متاسف اور برافروختہ مولانا ہیں نہ جرات اظہار اور حق گوئی کے پیکر شاہ حسن عطا ہیں۔ نہ واقعات کے راوی ظہیر بھائی ہیں۔ سب خاموش ہو گئے۔ صرف لکھا ہوا حرف زندہ رہ گیا۔ لکھا ہوا حرف زندہ رہتا ہے۔ ظہیر بھائی بھی اسی حرف زندہ کے حوالے سے زندہ رہیں گے۔

☆☆☆

پروفیسر عشرت حسین فاروقی
شعبہ کامرس، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ظہیر۔ میرا دوست

''ظہیر بہت میاں آدمی ہیں'' یہ تاثر کم وبیش ہر اس شخص کا ہوتا تھا جو ان سے متعارف ہوتا اور انکے خیالات اور کردار وعمل سے واقفیت رکھتا تھا میں بڑے فخر سے اور بلاخوف تردید یہ کہہ سکتا ہوں کہ ظہیر کے متعلق کوئی دوسری رائے قائم کی ہی نہیں جا سکتی تھی۔ آج ان کو ''ہیں'' کی جگہ ''تھے'' لکھتے ہوئے اپنے آپ کو کس قدر مجبور اور لاچار پا رہا ہوں کہ وہ ''میاں'' صفت انسان ایک سال پہلے ہمیں داغ مفارقت دے گیا۔ اس ایک لفظ میں انکی جملہ خوبیاں پنہاں تھیں۔ اگر سمندر کو کوزے میں بند کرنے کا محاورہ کہیں صادق آتا ہے تو وہ ظہیر کو میاں کہہ کر ہوتا ہے۔ یہ لفظ انکی پوری شخصیت کی بہت اچھی عکاسی کرتا ہے۔

میں ۱۹۴۴ء میں منٹو سرکل (جواب ایس۔ ٹی اسکول کہلاتا ہے) کی نویں جماعت میں داخل ہوا۔ آٹھویں کلاس میں نے سابق حیدرآباد اسٹیٹ کے ضلع پربھنی سے کیا تھا۔ علی گڑھ میں پڑھنے کا شوق مجھے بچپن سے تھا جو نویں کلاس میں پورا ہوا۔ اسکول میں میرا دوسرا دن تھا۔ اردو کی کلاس تھی جو شاید ٹونکی صاحب یا اصغر علی صاحب لے رہے تھے۔ انہوں نے ہر طالب علم سے اسکے بارے میں کچھ سوال پوچھے۔ جب میری باری آئی تو پوچھا کسی شاعر کا نام بتاؤ جسے تم نے پڑھا ہو اور پسند کرتے ہو۔ میں نے اپنی دھاک جمانے کے لئے پوچھا ''سر اردو شاعر کا نام بتاؤں یا فارسی شاعر کا۔ میرے جواب پر کلاس کے لڑکے ہنس پڑے اور

استادمحترم کو میری جسارت پسند نہ آئی۔ انہوں نے کہا میں اردو کے شاعر کا نام معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ جواب میں میں نے فانی بدایونی کا نام لیا۔ میرے کانوں میں ایک ساتھ کئی آوازیں آئیں ''لو ظہیر تمہارا ایک ساتھی اور آ گیا''۔ اس طرح اپنی کلاس کے جس لڑکے کا نام میں نے سب سے پہلے سنا وہ ظہیر تھا۔ کلاس کے بعد ہم دونوں نے ایک دوسرے سے تعارف کروایا۔ ظہیر نے کہا کبھی گھر پر آؤ۔ میں نے بتایا کہ میں ابھی نووارد ہوں راستہ نہیں جانتا۔ اپنے والد کے ساتھ حاذق صاحب کے مکان پر ٹھہرا ہوں جو شعبہ فارسی میں استاد ہیں۔ شاید میرے والد بھی شعبہ میں کچھ عرصہ فارسی پڑھائیں گے۔ ظہیر نے اپنے والد جناب ضیاء احمد بدایونی کے بارے میں بتایا۔ اس طرح ہم لوگوں کا باقاعدہ ملنا جلنا شروع ہو گیا۔ ایک بار ظہیر نے پوچھا تم فانی کو کیسے جانتے ہو۔ تب میں نے بتایا کہ میرے والد ابرار حسین فاروقی صاحب اور فانی کا تقرر حیدرآباد میں ایک ساتھ ہی ہوا تھا اور دونوں دو اسکولوں کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے تھے۔ اور انہیں مشاعروں میں سننے کا بھی اتفاق ہوا تھا۔

یہ ہماری پہلی تفصیلی ملاقات تھی۔ پھر ہماری دوستی کی ایسی بناء پڑی کہ کم و بیش ساٹھ سال ہم دونوں ایک دوسرے سے انتہائی قریب رہے۔ اس پورے عرصہ میں مجھے یاد نہیں پڑتا کہ کبھی بھی کوئی ایسا واقعہ پیش آیا ہو کہ ہم دونوں میں کوئی ٹکراؤ یا رنجش پیدا ہوئی ہو۔ اور یہ سب اس لئے ہوا کہ ظہیر بہت ''میاں آدمی'' تھے ورنہ میری تو نہ جانے کتنے لوگوں سے بنی اور بگڑی ظہیر میں خلوص، اپنائیت، درگزر کرنے کی صلاحیت، محبت، نیک نیتی، یگانگت اور دوستی نبھانے کا فن بدرجۂ اتم موجود تھے۔ ان کی دوستی کا فیضان عام تھا۔ اس کے لئے ہم مذہب، ہم مسلک، ہم زبان، ہم مقام ہونا ضروری تھا نہ معاشی و معاشرتی اعتبار سے یکسانیت کی شرط تھی۔ آج کے سماج میں بالعموم اور علی گڑھ میں بالخصوص سماجی رشتوں کی بنیاد سماجی و طبقاتی برابری اور سیاسی و مسلکی ہم آہنگی پر ہوتی ہے۔ مگر ظہیر ایک اچھے انسان تھے اور اسی لئے انسان دوست۔ وہ تعصب اور تنگ نظری سے کوسوں دور تھے اور وسیع القلبی و وسیع النظری کی جیتی جاگتی تصویر۔ کسی انسان کے کردار کو پرکھنے کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ یہ نہ دیکھو کہ اس کے افسر اور بڑے لوگ اس کے بارے میں کیا کہتے ہیں بلکہ یہ

دیکھو کہ اس کے ماتحت اور اس سے نیچے کے لوگوں کی اس کے بارے میں کیا رائے ہے۔ دنیا میں کم لوگ ہیں جو اس معیار پر کھرے اترتے ہیں اور بلا شبہ ظہیر انہیں معدودے چند لوگوں میں تھے۔ اونچ نیچ، امیر غریب، حسب نسب کی تفریق کے وہ قائل نہیں تھے۔ ان کے پاس آدمی کو جانچنے کا صرف ایک پیمانہ تھا جس کی وہ قدر کرتے تھے یعنی انسانیت اور انسان دوستی۔

عموماً دو طرح کے لوگوں کی حیات و خدمات پر سیر حاصل تبصرہ کرنا دشوار ہوتا ہے۔ ایک وہ لوگ جو صرف خوبیوں کا مجسمہ ہوں۔ ان کی ساری خوبیوں کا احاطہ ایک مضمون میں کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہوتا۔ ظہیر کا شمار ایسے ہی افراد میں کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے وہ لوگ جن کے اندر کوئی بڑی خوبی نہیں بلکہ بہت سی چھوٹی چھوٹی اچھائیاں اور برائیاں ہوتی ہیں۔ انہیں تلاش کر کے واضح کرنا بھی دشوار العمل ہے۔ خاکسار انہیں لوگوں میں سے ہے۔

میں اکثر سوچتا ہوں کہ ہم دونوں کیوں کر ایک دوسرے کے اس قدر قریب آئے اور وہ کون سی قدر مشترک تھی جس نے اسقدر مستحکم اور دیرپا دوستی کی بنیاد رکھی۔ ظہیر اردو کے قد آور طالب علم اور ادیب، متعدد کتابوں کے مؤلف و مصنف، قابل قدر نقاد، خوش گو شاعر۔ میں کامرس کا طالب علم اور پھر یہی میرا ذریعہ معاش بنا تھوڑی بہت جو اردو سے واقفیت ہے اس کا سبب والد بزرگوار کی سرپرستی اور گھر کا ماحول جس کو جلا ملی ظہیر کی دوستی سے اور بعد میں اپنے محترم اور بزرگ دوست مالک رام صاحب کی صحبت سے۔ لطف یہ کہ ہائی اسکول میں میرا مضمون عربی تھا اور کامرس ظہیر کا۔ یونیورسٹی میں آکر ہم دونوں الگ راستوں پر چل پڑے۔ مزید براں ہمارے خیالات و نظریات اور انداز فکر بھی الگ الگ تھے۔ میں بائیں بازو کی سیاسیات و سماجیات سے متاثر ظہیر دائیں بازو کے نظریات کے قائل۔ میں کسی حد تک آزاد طبع تو وہ رسم و رواج اور پرانی قدروں کے دلدادہ۔ میں چھوٹی خوبیوں تک سے محروم وہ خوبیوں کا مرقعہ۔ ان تمام مختلف النوع خصوصیات کے باوجود ہم دوست بنے اور ایسے دوست کہ کوئی شخص یا کوئی واقعہ اس میں رخنہ نہ پیدا کر سکا۔

یونیورسٹی کی تعلیم مکمل کر کے میں شبلی کالج اعظم گڑھ میں لکچرار ہو گیا اور ظہیر کچھ دن ریسرچ میں داخلہ لینے کے بعد دلّی کالج میں لکچرار ہو گئے۔ لیکن دونوں برابر علی گڑھ کی جانب دیکھتے رہے۔ حسن اتفاق سے مجھے موقعہ مل گیا اور علی گڑھ کے شعبہ کامرس میں مستقل آسامی پر میرا تقرر ہو گیا اور سوئے اتفاق ہی کہوں گا کہ دہلی نے ظہیر کو ایسا جکڑا کہ ملازمت کا پورا زمانہ دہلی ہی میں گزرا۔ لیکن ایک دوسرے طریق سے ان کا رشتہ بھی علی گڑھ سے قریب تر ہو گیا یعنی ان کی نصف بہتر ویمنس کالج علی گڑھ میں ملازم ہو گئیں اور اس طرح ظہیر آدھے علی گڑھ اور آدھے دلی کے بنے رہے۔ لیکن کچھ سالوں کے بعد وہ بھی شوہر کے پاس دہلی چلی گئیں اور دہلی کالج ہی میں ملازم ہو گئیں۔ ملازمت کا سارا زمانہ دہلی میں گزرنے کے بعد جب سبکدوش ہوئے تو علی گڑھ میں سکونت اختیار کرنے کا فیصلہ کیا مگر عمر نے وفا نہ کی۔

دہلی کی زندگی کے شروع کے چند سال کالج کے دو رہائشی کمروں میں گزارے۔ اس زمانہ میں میں جب بھی دلی جاتا تو قیام ظہیر کے ساتھ ہی رہتا۔ چند سال بعد ان کا تقرر دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں بہ حیثیت ریڈر کے ہو گیا اور وہ یونیورسٹی کے مکان میں منتقل ہو گئے ظہیر جس عمر میں اپنی قابلیت اور محنت کی بنا پر ریڈر کی جگہ پا گئے اس عمر میں ان کے بیشتر ساتھی لکچرر ہی رہے۔ اپنی تصنیفات اور ادبی خدمات کی وجہ سے وہ اردو دنیا میں ایک منفرد مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکے۔ شاعری جو ان کو ورثہ میں ملی تھی اس نے ان کی مقبولیت میں مزید اضافہ کیا اور وہ وسیع تر حلقہ میں روشناس ہو گئے۔

ظہیر کو سرسید احمد خاں اور علی گڑھ کے ساتھ ساتھ اردو سے بھی عشق تھا۔ اگر وہ اردو کے پروفیسر نہ بھی ہوتے تب بھی یہ عشق قائم رہتا۔ ہندوستان میں اور بیرون ہند شاید ہی کوئی ادارہ یا تنظیم ایسی ہو جس سے ظہیر منسلک نہ رہے ہوں اپنے علمی و تعلیمی مشاغل کے باوجود اردو کے مختلف اداروں کی خدمت کے لئے درمے، سخنے، قدمے ہر طرح تیار رہتے تھے اور اس کے لئے سفر کو ہمہ وقت تیار رہتے تھے اور نہ موسم کی سختی کی پرواہ کرتے تھے۔ نہ صحت کی نہ سفر کی دشواریوں کی۔ سرسید پر شاید ہی کوئی سیمینار ایسا ہوا ہو جس میں ظہیر شریک

نہ ہوئے ہوں۔علی گڑھ کی تحریکات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔جس دور میں علی گڑھ کے اقلیتی کردار کی لڑائی لڑی جارہی تھی ظہیر ایک بہادر سپاہی کی طرح صف آرا رہے۔

ان کے کردار کی ایک بہت اہم خوبی ''صلہ رحمی'' تھی جس کا اندازہ یا تو ان کے خاندان کے افراد کو تھا یا پھر مجھ ایسے قریبی دوستوں کو۔یہ جذبہ ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔خاندان کے ضرورت مند افراد کی ضرورت کو نہایت خندہ پیشانی سے پورا کرتے تھے۔چاہے وہ تعلیمی ضروریات ہوں، رہائش کا انتظام کرنا ہو۔بیمار کا علاج اور تیمارداری کرنا ہو وہ ہر ایک کی حتی المقدور مدد کرنے کو تیار رہتے تھے۔میں جب کبھی ان کی قیام گاہ پر گیا تو شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہو کہ کوئی ان کے یہاں اپنے کام سے نہ ٹھہرا ہوا ہو۔اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں وسائل فراہم کئے تھے مگر دنیا میں ایسے کتنے لوگ ہیں جو اپنی اخلاقی ذمہ داریوں کو پورا کرتے ہیں۔

میں نے زندگی کے ان گنت مصروف اور فرصت کے لمحات ان کے ساتھ گزارے۔ان کو وہ شوق نہیں تھے جو عموماً جوانی کی عمر میں لوگوں کو ہو جاتے ہیں۔طالب علمی کے زمانہ میں کبھی کبھار سنیما دیکھ کر تفریح کا شوق پورا کر لیتے تھے۔یا پھر اپنے بڑے بھائی رفیق احمد کے اصرار پر تاش کے کھیل میں شریک ہو جاتے تھے۔کبھی مجھے بھی شریک کرنے کی کوشش کی جاتی تو میں رسی تڑا کر بھاگ لیتا۔اس کے علاوہ مرحوم کو کسی قسم کے لہو و لعب سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

ظہیر کو اپنے وطن مالوف یعنی بدایوں سے بڑا لگاؤ تھا اور وہ وہاں جانے کا بہانہ ڈھونڈھتے رہتے تھے۔انہیں اس پر بھی بڑا فخر تھا کہ بدایوں کو مدینۃ الاولیا کہا گیا ہے۔انہیں بزرگان دین سے بھی بہت عقیدت تھی مگر ہر قسم کی بدعت سے اپنے کو دور رکھتے تھے۔

ان کا اردو ادب میں کیا مقام تھا اس پر ان کے وہ ساتھی مجھ سے بہتر روشنی ڈال سکیں گے جنھوں نے برسوں ان کے شانہ بشانہ کام کیا ہے۔میں تو انہیں صرف ایک دوست اور اچھے انسان کی حیثیت سے جانتا ہوں۔میری زندگی کا کوئی بڑا اور اہم مسئلہ ایسا نہ تھا جس

میں ظہیر کی رائے اور مشورہ میں نے نہ لیا ہو اور انکی دانشمندانہ اور تجربہ کارانہ رائے سے فیض نہ اٹھایا ہو۔ مجھے یاد نہیں کہ کبھی میں نے ظہیر سے کسی کام کے لئے کہا ہو اور انہوں نے بغیر سوال کئے اسے مکمل طور پر نہ انجام دیا ہو۔ میں جب بھی دہلی کسی کام سے جاتا اور میرا کوئی کام نامکمل رہ جاتا تو میں وہ کام ظہیر کو سونپ کر بالکل مطمئن ہو جاتا کہ وہ اسے مجھ سے بہتر طور پر پورا کر دیں گے۔

دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو کی داغ بیل خواجہ فاروقی صاحب مرحوم نے ڈالی تھی۔ ان کی دور اندیش اور مردم شناس نگاہوں نے ظہیر کا انتخاب اپنے معتمد خاص کے طور پر شعبہ میں ریڈر بنا کر کیا اور اس طرح شعبہ کی ترقی کو یقینی بنا دیا۔ جس پودے کو فاروقی صاحب نے لگایا اس کی پرداخت اور آبیاری ظہیر نے بڑی لگن دیانت داری اور محنت سے کی اور اس طرح سے دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کو دوسری یونیورسٹیوں کے اردو کے شعبوں سے ایک ممتاز اور نمایاں اہمیت کا حامل بنا دیا۔ مجھے یاد آرہا ہے۔ ایک بار میں اور ظہیر بات کر رہے تھے۔ مولانا حالی نے غالب کا جو مرثیہ لکھا ہے وہ ہماری گفتگو کا موضوع تھا۔ ظہیر کہہ رہے تھے کہ یہ مرثیہ حالی کا ہی نہیں اردو شاعری کا بھی شاہکار ہے۔ میں نے از راہ تفریح کہہ دیا کہ افسوس میں شاعر نہیں ہوں ورنہ تمہارے مرنے پر میں بھی ایسا ہی شاندار اور پروقار مرثیہ لکھ دیتا۔ اس پر ظہیر نے کہا تھا کہ اگر تم پہلے مرے تو میں یقین دلاتا ہوں کہ تمہارا بہتر سے بہتر مرثیہ کہوں گا۔ افسوس کہ مجھے یہ فخر حاصل نہ ہو سکا کہ وہ میرا مرثیہ لکھتے۔ انہوں نے پہلے داعئ اجل کو لبیک کہہ دیا اور میری مزید بدقسمتی یہ کہ مرثیہ تو کیا ان کے شایان شاں ایک تعزیتی مضمون بھی قلمبند کرنے سے خود کو قاصر پا رہا ہوں۔ یہ چند صفحات لکھنے کی جرات صرف اس لئے کی کہ مجھے نصف صدی سے زیادہ ان کی دوستی اور قرب کا شرف حاصل رہا۔ مجھے ان سے محبت تھی۔ انسیت تھی اور انہیں ایک شریف النفس انسان سمجھتا ہوں اور سمجھتا تھا۔ میں اپنی بات اس مصرعہ پر ختم کرتا ہوں۔

آفاق ہا گردیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

☆☆☆

سعید احمد صدیقی
اشوک اٹلیو، فرید آباد

ظہیر بھائی

ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی رشتہ کے اعتبار سے میرے حقیقی ماموں تھے لیکن ابتدائی پرورش ننھیال میں ہونے کی وجہ سے ان کے چھوٹے بھائیوں کے ساتھ میں بھی انہیں ظہیر بھائی کہنے لگا تھا۔ آگے چل کر میری بیوی، بچیاں اور بیٹیوں کے بچے بھی انہیں اپنے رشتہ سے مخاطب کرنے کی بجائے ظہیر بھائی ہی کہتے تھے۔ شاید اس کی وجہ انکا بے تکلفانہ اور سدا بہار دلچسپ انداز گفتگو تھا جس کی وجہ سے بچے بھی انہیں نانا وغیرہ کہنا پسند نہ کرتے تھے۔

ظہیر بھائی کی ادبی حیثیت اور منصب کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ ویسے بھی اس کے بارے میں لکھنے کا میں اپنے کو اہل نہیں سمجھتا اسلئے اپنے ذاتی مشاہدے اور تجربہ کی روشنی میں انکی شخصیت کے کچھ ایسے پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گا جو ان کے کردار کا بہت اہم جزو رہے ہیں۔ ظہیر بھائی کو کبھی شرارت کرتے نہیں دیکھا گو کہ ان سے بڑے بھائی (رفیق احمد میکش بدایونی) کی شرارتوں کے مدہم نقوش ذہن میں اب بھی موجود ہیں۔ بلکہ کئی باریوں بھی ہوا کہ اپنے بڑے بھائی کو سزا سے بچانے کے لئے انہوں نے انکی شرارت کو اپنے سر اوڑھ لیا لیکن ان کے اقرار کا بھی کسی کو یقین نہیں آیا اور شبہ کی سوئی اصلی مجرم کی جانب ہی گھوم گئی۔

یوں تو اس زمانہ میں بھی ان کے بہت سے دوست تھے جن میں سے کچھ خاص نام یہ ہیں۔عزیزوں میں نیر اقبال کمالی، تنویر احمد صدیقی، وصی احمد کمالی، کپتن راشد فاطمی وغیرہ۔ اسکول کے ساتھیوں میں فہیم صاحب، صابر علی خاں رفیع الزماں زبیری، ڈاکٹر نسیم انصاری، پروفیسر محمد محسن، پروفیسر عشرت فاروقی اور کلیم اللہ خاں۔قابل ذکر بات یہ ہے کہ ان سب کے ساتھ انہوں نے نصف صدی سے بھی زیادہ کا عرصہ پورے خلوص اور استواری کے ساتھ نبھایا اور اس دوستی کی عمارت میں کبھی دراڑ بھی نہ آنے دی آخر ان کی موت نے ہی اس رشتہ کو ختم کر دیا۔

ڈاکٹر شمیم نکہت نے اپنے مضمون میں لکھا ہے ''ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی اگر ایک اچھے محقق اور تنقید نگار نہ ہوتے تو یقیناً ایک کامیاب مزاح نگار ہوتے''۔ یہ بات بالکل صحیح ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ وہ مزاح نگار نہ ہو کر بھی اپنی روزمرہ کی زندگی میں بات بات میں شگفتگی اور مزاح پیدا کر دیتے تھے۔ یہ صفت ان میں بچپن سے موجود تھی۔اپنے اسکول کے ساتھیوں پر رعب ڈالنے کے لئے وہ جو ڈینگیں ہانکا کرتے تھے وہ کچھ اس قسم کی ہوتی تھیں۔''وائسرائے۔ وہ تو روز میرے جوتوں پر پالش کرنے آتا ہے۔ علامہ اقبال اپنے کلام پر اصلاح لینے میرے پاس آتے ہیں۔ وغیرہ'' اس پر ان کے ایک پنجابی دوست نے کہا تھا جھوٹ۔ وہ تمہارے والد سے اصلاح لیتے ہوں گے تم ایسے ہی اپنا نام لے رہے ہو۔اس زمانہ میں ہمارے گھر میں طلسم ہوشربا کا بہت زور تھا اس کی اصطلاحیں اور نام ظہیر بھائی کو ازبر تھے۔انہوں نے کسی کو ''بغدہ گراں'' کسی کو ''مش مش جادو'' اور کسی کو ''آفات چہار دست'' کا نام دیا ہوا تھا۔ کسی بات پر ان کے دوست ''بغدہ گراں'' ان سے ناراض ہو گئے اور بولے بھاگو میں تم سے نہیں کھیلوں گا۔ ظہیر بھائی نے بہت شان سے جواب دیا ''اچھا مابدولت تشریف لے جا رہے ہیں'' ان کے دوست تنک کر بولے۔ مابدولت گدھے۔ مابدولت الّو۔ مابدولت پاگل۔ بزرگوں کی مجلس ہو یا نوجوانوں کی بے تکلفانہ محفل انکی حاضر جوابی اس کو زعفران زار بنا دیتی تھی ان کے گھر پر اکثر ہی مہمانوں کا نزول رہتا۔ وہ ہر ایک کی تواضع بھی حسب مراتب کرتے رہتے۔ اگر کوئی تواضع کے جواب میں

ظہیر احمد صدیقی شعبہ کے ایک فنکشن میں جوش ملیح آبادی کے ساتھ۔

کہد یتا کہ جی میں تو اپنا ہی گھر سمجھتا ہوں تو فوراً اگلا جملہ یہ ہوتا کہ ارے ایسا غضب نہ کیجئے گا۔ اگر کیپٹن سالک رام (انکے مالک مکان) نے سن لیا تو فوراً نکال دیں گے کہ انہوں نے تو گھر پر قبضہ کرلیا۔ اگر کوئی کھانے میں شریک ہونے میں تکلف سے کام لیتا تو کہتے "آجاؤ بھئی پودینہ کی چٹنی بھی ہے۔" اس کے پیچھے ایک دلچسپ واقعہ یہ تھا کہ ایک بار کوئی صاحب ظہیر بھائی کے یہاں ملنے گئے۔ گھر کے لوگ کھانا کھا رہے تھے اور میز پر کئی اقسام کے کھانے موجود تھے۔ ان صاحب سے بھی کھانے میں شریک ہونے کو کہا گیا۔ انہوں نے اول تو انکار کیا لیکن کھانوں کی اقسام دیکھ کر ان کا ارادہ بدل گیا اور انہوں نے میز پر دوبارہ نگاہ ڈالتے ہوئے کہا "ارے کھانے میں پودینہ کی چٹنی بھی ہے۔ یہ تو میری کمزوری ہے" یہ کہہ کر کھانے میں شریک ہو گئے اور پودینہ کی چٹنی کے سوا ہر چیز ڈٹ کر کھائی۔ یوں ظہیر بھائی کے ہاتھ ایک نئی اصطلاح آ گئی۔

اصطلاح سازی میں وہ ویسے بھی ماہر تھے۔ کوئی کہیں جانے کے لئے تیاری میں زیادہ اہتمام سے کام لیتا تو اس کو ٹوکتے کہ اسقدر تکلف کی کیا ضرورت ہے بس "اردو میں چلو"۔ کوئی بہت سست قدموں سے چلے تو کہتے "ہجّے کر کے کیوں چلتے ہو"۔ کسی چیز پر اگر "بس کرو" کہا ہوتا تو ہمیشہ Roadways کہتے۔ اور مانگنا ہوتا تو کہتے Peacock (مور)۔ انکی یہ حس مزاح آخر تک قائم رہی۔ جب آخر میں 'Alzheimers کے موذی مرض میں گرفتار ہو کر ان کا حافظہ کمزور ہونے لگا تھا تو ایک بار دہلی حکیم عبدالحمید صاحب کو دکھانے گئے اور حافظہ کی کمزوری کی شکایت کی۔ حکیم صاحب جو خود بھی بڑے خوش گفتار انسان تھے فرمانے لگے "بھئی اس میں کیا پریشانی ہے۔ یہ تو بڑی اچھی بات ہے لوگوں پر احسان کیا کیجئے اور بھول جائے"، ظہیر بھائی نے برجستہ جواب دیا" قبلہ یہ تو بجا فرمایا مگر پریشانی یہ ہے کہ دوسرے لوگ میرے اوپر جو احسان کریں گے انہیں بھی بھول جاؤں گا"

ظہیر بھائی دو باتوں میں کسی کا دل دکھانے کے قائل نہیں تھے۔ ایک تو وہ ہر کسی کی دعوت قبول کرنا اخلاقاً ضروری سمجھتے تھے دوسرے کوئی انہیں اپنا مجموعہ کلام یا کوئی بھی تصنیف تبصرے کے لئے بھیجے تو انکار کرنا ان کے مزاج کے خلاف تھا خواہ وہ کتاب کتنی بھی

مہمل اور گھٹیا کیوں نہ ہو۔ ایک بار مسز ظہیر کو بھی ایسی ہی صورت حال سے واسطہ پڑا۔ ایک مرتبہ کسی شاعر نے اپنی کتاب ان کے پاس تبصرہ کے لئے بھیجی۔ ان کی شاعری نہ صرف غیر معیاری اور ناموزوں تھی بلکہ اس میں زبان کی غلطیاں بھی تھی مسز ظہیر نے چاہا کہ کتاب معذرت کے ساتھ واپس کر دیں مگر ظہیر بھائی کا اصرار تھا کہ بیچارے کا دل ٹوٹ جائے گا۔ وہ بولیں ''دل تو اس وقت اور بھی ٹوٹے گا جب میں اس کی خامیاں لکھوں گی''۔ ظہیر بھائی نے مشورہ دیا ''تم ایسا کرو کہ کتاب کی خوبیوں یا خامیوں پر تبصرہ کرنے کی بجائے موضوع کی اہمیت اور اس کی ضرورت پر لکھ دو۔ میں تو ایسی صورت میں یہی کرتا ہوں''

میں نے ابتداء میں ڈاکٹر شمیم نکہت کے ایک جملہ کا حوالہ دیا ہے۔ اس کی تائید کرتے ہوئے میں اس میں تھوڑی ترمیم بلکہ اضافہ کرنے کی اجازت چاہوں گا۔ کہ اگر وہ پروفیسر، صدر شعبہ، ڈین فیکلٹی آف آرٹس اور اچھے ادیب و نقاد نہ ہوتے تو بہت بڑے درویش ہوتے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ کوئی بھی اعلیٰ عہدہ ہو وہ انسان کے ظرف کا امتحان ضرور لیتا ہے لیکن ظہیر بھائی کی شخصیت میں جو سادگی و خاکساری تھی اس میں کسی دور میں فرق نہیں آیا۔ ان کے یہاں آرام کا تو کوئی خانہ ہی نہیں تھا کیونکہ وہ ''آرام ہے حرام'' کے مقولہ پر سختی سے کاربند تھے۔ ان کے کھانا کھاتے میں اگر کوئی طالب علم یا چپراسی بھی آجاتا تو وہ کھانا چھوڑ کر پہلے اس کی بات سنتے۔ کسی کو انتظار کروانا ان کے مسلک میں جائز نہیں تھا۔ ان کا دھوبی جو اتوار کی صبح کو آتا تھا اسے بھی کپڑے لکھے ہوئے تیار رکھے ملتے تھے۔ شاید ہی اسے کبھی دروازہ پر کھڑا رہنا پڑا ہو۔ یہ اوصاف انہیں اپنے والد پروفیسر ضیاء احمدؒ صاحب سے ورثہ میں ملے تھے۔ صرف ورثہ ہی نہیں بلکہ شعوری طور پر بھی انکی ہمیشہ یہ ہی کوشش رہی کہ اپنے والد کی ذات سے جتنا بھی حاصل کر سکیں کر لیں۔ حق گوئی، وعدہ کی پابندی، ہر کام منظم طریقہ سے اور سلیقہ سے کرنا، مطالعہ کی عادت، خطوں کے جواب فوراً دینا اور بہت سی خوبیاں انہوں نے اپنے والد صاحب سے ہی حاصل کی تھیں۔ علم کے معاملہ میں بھی انہوں نے سقراط کی طرح علم کے اس سمندر کے کنارے سے ہی ہاتھ گیلے کر لئے تھے تو اس مرتبہ تک پہنچے جس سے ہم آپ سب واقف ہیں۔ ظہیر بھائی کو خدا نے بلند علمی منصب اور عزت

وآرام کے تمام سامان بخشے تھے مگر ان کی سادگی زبان حال سے کہتی محسوس ہوتی تھی۔

بازار سے گزرا ہوں خریدار نہیں ہوں۔

اچھا لباس وہ آرام کے لئے پہنتے تھے نمائش کے لئے نہیں۔ کار ہوتے ہوئے بھی انہیں اسکوٹر یا بس سے چلنے میں کوئی عار نہ تھا۔ اچھے کھانے انہیں پسند ضرور تھے لیکن معمولی اور بے مزہ کھانے کو بھی اس طرح کھا لیتے جیسے وہ 'ککڑوں کوں' کھا رہے ہوں۔ نمک تیز ہو یا پھیکا کبھی ملازمہ (جنہیں وہ بڑی بی کی جگہہ کیپٹل B کہتے تھے) پر ناراض نہیں ہوتے تھے۔ ایک بار کا ذکر ہے کہ انکی بیوی اپنے والد کی علالت کے سلسلہ میں کافی طویل عرصہ کے لیے علی گڑھ چلی گئیں۔ گھر پر کام کے لئے ایک لڑکا ملازم تھا جو تھوڑا بہت کھانا پکانا جانتا تھا۔ ظہیر بھائی بہت قناعت کے ساتھ اس کے پکائے کھانے پر گزر کرتے رہے۔ ایک بار انکی بیوی نے پوچھا کہ کوئی پریشانی تو نہیں تو جواب دیا کہ وہ تو سب چیز پکانا سیکھ گیا ہے اور حلوہ و شاہی ٹکڑے بھی پکا لیتا ہے بیوی نے حیرت سے پوچھا شاہی ٹکڑے؟ کیسے پکائے تھے تو اپنے مخصوص انداز میں مسکرا کر بولے کیسے کیا۔ بس بیٹھے تھے۔ ان کے سادہ رہن سہن کو دیکھ کر ہو سکتا ہے لوگ انہیں کنجوس خیال کرتے ہوں۔ لیکن انکی کفایت شعاری اپنی ذات تک محدود تھی۔ اپنے عزیزوں، دوستوں اور ضرورت مندوں کی مدد کرنے میں وہ بہت فیاض تھے۔ میرے علم میں نہیں کہ کسی نے ان سے مدد چاہی ہو اور خالی ہاتھ لوٹا ہو۔ جو لوگ ان سے ادھار لے کر واپس نہیں کرتے تھے ان کو بھی ضرورت پڑنے پر وہ مایوس نہیں کرتے تھے۔ ان لوگوں میں سے ایک میں بھی تھا۔ کئی عزیزوں کو انہوں نے اپنے گھر کے فرد کی طرح رکھ کر تعلیم دلوائی۔ ان کے گھر کے دروازے ہر ایک کے لئے کھلے رہتے تھے اور عزیز دوست ہفتوں ان کے مہمان رہتے۔ یہ سلسلہ دلّی کالج کے دو کمروں میں بھی چلتا تھا اور مال روڈ کے یونیورسٹی کے پروفیسرس کالونی کے مکان میں بھی۔ انکی عنایات صرف دوستوں اور شاگردوں پر ہی نہیں ان لوگوں پر بھی رہیں جنھوں نے بعض موقعوں پر انکی مخالفت کی اور ان کے راستہ کا روڑا بنے وہ صرف محبت میں یقین رکھتے تھے جو یقیناً درویشوں اور صوفیوں کی صفت ہے۔ انکی کبھی کسی سے لڑائی نہیں ہوئی۔ نہ بچپن میں بہن بھائیوں سے نہ طالب علمی کے زمانہ میں دوستوں سے نہ جوانی میں بیوی سے اور نہ اپنے ساتھیوں سے۔ انکی اس خوبی

کی سب سے بڑی اور مستند گواہ انکی بیوی ہیں جو اس بات کی معترف ہیں کہ رفاقت کے اس طویل عرصہ میں کبھی ظہیر بھائی نے ان سے سخت کلامی بھی نہیں کی۔ کسی بات پر اختلاف ہوا تو دونوں نے مل جل کر کوئی راہ تلاش کر لی۔ کبھی ٹکراؤ کی نوبت نہیں آئی۔ اگر آنے والی ہوتی تو ظہیر بھائی کا دلچسپ اور مزاحیہ پیرایۂ گفتگو ماحول کو خوشگوار بنا دیتا اور تکدر کے بادل صاف ہو جاتے مثلاً مسز ظہیر کو ان سے یہ شکایت رہتی کہ وہ اپنی مصروفیات میں بچوں کے داخلے، پڑھائی وغیرہ سے بالکل دلچسپی نہیں لیتے۔ ایسا بھی ہوتا کہ اس موضوع پر وہ ظہیر بھائی کا گھراؤ کر لیتیں مگر وہ بڑی آسانی سے یہ کہہ کر صاف نکل جاتے کہ بھئی جب ماں اتنی قابل ہو تو پھر باپ کو فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ایسے ہی ایک موقعہ پر جب وہ خفا ہو رہی تھیں تو ظہیر بھائی کی ایک بھانجی بولیں کہ ماموں میاں آپ بات مان لیں ورنہ آپ کی بیگم وہ گانا شروع کر دیں گی ''میں میکہ چلی جاؤں گی تم دیکھتے رہیو'' اس زمانہ میں ظہیر بھائی کی والدہ اور مسز ظہیر کی والدہ دونوں انکے گھر آئی ہوئی تھیں۔ ظہیر بھائی نے دونوں کی طرف اشارہ کیا اور بولے۔ بھئی یہ میکہ ہے وہ سسرال جہاں بھی چاہیں جائیں رہیں گی تو ہمارے پاس ہی۔ وہ نہ صرف خود لڑائی جھگڑے سے کوسوں دور رہتے بلکہ دوسرے لوگوں میں مصالحت کرانے میں نمایاں رول ادا کرتے۔ گھر یا خاندان میں کسی کا کسی سے جھگڑا ہو۔ ڈپارٹمنٹ میں ساتھیوں میں کوئی ٹکراؤ ہو ظہیر بھائی فوراً ثالث بن کر صلح کرا دیتے۔ انکی اس عادت سے سب ہی واقف ہو گئے تھے۔ کئی بار تو ان کے وائس چانسلر نے انہیں بلا کر کہا کہ آپ کے پڑوس میں فلاں پروفیسروں میں روز جھگڑا ہوتا ہے۔ آپ ذرا انہیں سمجھائے۔ سروپ سنگھ صاحب کا یہ کہنا بھی ان کے لئے ایک خراج تحسین ہے کہ ہر ڈپارٹمنٹ کے پرانے اور نئے ہیڈ کے درمیان مستقل اختلافات رہتے ہیں سوائے اردو ڈپارٹمنٹ کے جہاں پروفیسر فاروقی اور ڈاکٹر صدیقی میں ویسے ہی تعلقات ہیں جیسے کہ پہلے تھے۔

ظہیر بھائی زندگی میں بھی درویشی کی بہت سی صفات کے حامل تھے اور اپنے ہر مسئلہ اور مشکل کو ''اللہ صاحب'' کے حوالے کر کے مطمئن ہو جاتے تھے۔ امید بلکہ یقین ہے کہ وہاں بھی وہ اللہ صاحب کی بخشش وعنایات سے بہرہ مند ہوں گے اور اللہ صاحب جنکی دوستی کا انہیں دعویٰ تھا وہی ان کی ہر منزل پر دستگیری کریں گے۔

سہیل احمد صدیقی
شاستری نگر، غازی آباد

ظہیر بھائی

عموماً انسان خوبیوں اور خامیوں دونوں کا مجموعہ ہوتا ہے اور اگر اسکی خوبیوں کا پلڑا خامیوں کے مقابلہ میں بھاری ہو تو اسے ایک اچھا انسان سمجھا جاتا ہے۔ لیکن ظہیر بھائی کے بارے میں سوچتا ہوں تو انکی شخصیت میں مجھے کوئی خامی نہیں نظر آتی حالانکہ میں کافی عرصہ تک ظہیر بھائی کی رہائش گاہ پر ان کے ساتھ رہا مگر ان کی ان گنت خوبیاں ہی سامنے آئیں۔

ایک زمانہ تک میری ان سے ملاقات گرمیوں کی تعطیلات تک محدود تھی جب وہ بدایوں آتے یا ہم لوگوں کا علی گڑھ تایا صاحب کے گھر جانا ہوتا۔ یا پھر خاندانی تقریبات میں جب سب عزیز جمع ہوتے ان سے ملاقات ہوتی۔ لیکن دس گیارہ سال کے عمر کے تفاوت نے مجھے ان سے کبھی بے تکلف نہ ہونے دیا۔ البتہ خاندان کے بزرگوں کی زبان سے انکی نیکی سعادت مندی اور صلح جوئی کی تعریف ہمیشہ سے سنتا آیا تھا۔ ظہیر بھائی کی سحر انگیز اور ہمہ جہت شخصیت کا مکمل ادراک مجھے اس وقت ہوا جب وہ دہلی یونیورسٹی میں پروفیسر تھے اور میں علی گڑھ سے تعلیم مکمل کر کے ملازمت کے سلسلہ میں دہلی پہنچا۔ میرا فتح پوری اسکول میں تقرر ہو گیا اور عرصہ تک میں ظہیر بھائی کے گھر پر ان کے ساتھ ہی رہا۔ اس قیام کے دوران ہمارے درمیان جو بڑے بھائی اور چھوٹے بھائی کا تکلف والا رشتہ تھا وہ آہستہ آہستہ بے تکلفی میں تبدیل ہو گیا اور انکی شخصیت کے وہ پہلو اجاگر ہوئے جن سے میں پہلے واقف نہ تھا۔

اب وہ میرے بڑے بھائی ہی نہیں میرے پرخلوص دوست، صائب الرائے مشیر اور غمخوار بھی ثابت ہوئے اور انہیں میں نے قریب ترین رشتوں سے بھی زیادہ مشفق اور ہمدرد پایا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب عم محترم ضیاء احمدؒ صاحب مسلم یونیورسٹی سے ریٹائر ہو کر دہلی یونیورسٹی میں اُنت کے ڈائرکٹر کے عہدہ پر بلا لئے گئے تھے اور ظہیر بھائی کے ساتھ ہی قیام فرما تھے۔ میرے وہاں پہنچنے پر ہم تین لوگ ہو گئے جبکہ ہم تینوں کی نصف بہتر علی گڑھ میں قیام پذیر تھیں۔ تائی صاحبہ تو اپنے گھر کی ذمہ داریاں سنبھالنے کی وجہ سے۔ مسز ظہیر (افن آپا) وہاں ویمنس کالج میں لکچرر ہو گئی تھیں۔ میری بیوی رضوانہ وہاں بی ایڈ کر رہی تھیں۔ لہٰذا ہم تینوں عام طور پر ہفتہ کی شام کو علی گڑھ کے لئے روانہ ہوتے اور پیر کی صبح کو دہلی آجاتے۔ تاؤ میاں کا اٹیچی بدھ کے دن سے کھل کر باہر رکھ جاتا تھا اور وہ ایک ایک کر کے اس میں ساتھ لے جانے والی چیزیں ڈالتے رہتے۔ سفر میں پہن کر جانے والی شیروانی اور چھڑی کھونٹی پر لٹک جاتی اور سنیچر کی صبح یونیورسٹی جاتے وقت اٹیچی کو بند کر کے چابی شیروانی کی جیب میں ڈالدی جاتی گویا سب تیاری مکمل ہے۔ ظہیر بھائی کا اٹیچی بھی جمعہ کو تو باہر نکل کر رکھ ہی دیا جاتا اور سنیچر کی سہ پہر کو اسٹیشن جانے سے چند گھنٹہ پہلے مکمل ہو کر رکھ جاتا اور بند کر دیا جاتا۔ میں جو ہمیشہ کا لیٹ لطیف ہوں ساڑھے تین بجے تھری وہیلر پر فتحپوری سے آتا۔ جلدی سے ایک جوڑا بریف کیس میں ڈال کر اور کئی ضروری چیزیں بھول کر اسی تھری وہیلر میں دونوں بزرگوں کو لے کر اسٹیشن روانہ ہو جاتا۔ ظہیر بھائی کھانا کھانے کو بھی کہتے مگر اتنا وقت ہی نہ ہوتا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ تاؤ میاں اور ظہیر بھائی میرا انتظار کر کے چل دیتے اور میں چلتی ہوئی ٹرین پکڑ کر سوار ہوتا پھر ان لوگوں سے علی گڑھ کے اسٹیشن پر ہی ملاقات ہوتی۔ ظہیر بھائی بڑی فراخ دلی سے میری کوتاہیوں کو درگزر کرتے۔ ہاں کبھی ظہیر بھائی کسی کام کی وجہ سے علی گڑھ نہ جا رہے ہوتے تو میں بڑے قاعدہ سے تاؤ میاں کے سفری مارجن (یعنی ٹرین کے ٹائم سے دو گھنٹہ قبل) پر تیار پور پہنچ جاتا اور انہیں ساتھ لے کر علی گڑھ جاتا۔ واپسی اکثر الگ الگ بھی ہو جاتی۔

ایک بار دسمبر کی چھٹی سے قبل میں اکیلا ہی علی گڑھ گیا۔ چند روز بعد چھٹی ہونے

والی تھی اس لئے پیر کی صبح ہر صورت سے واپس ہونا تھا۔ رات کو سامان لے کر اسٹیشن پہنچا۔ جوئے شیر (یہ نام ظہیر بھائی نے دودھیوں کی علی گڑھ والی گاڑی کو دیا ہوا تھا) کا ٹکٹ بھی لے لیا۔ میری بیوی اسٹیشن تک ساتھ آئی ہوئی تھیں۔ وہ بضد تھیں کہ آج نہ جایئے۔ کل میری کچھ ضروری شاپنگ کروا کے چلے جائے انکی ''تریاہٹ'' کے آگے مجھے ہتیار ڈال دینا پڑے اور میں ٹکٹ واپس کر کے گھر آ گیا۔ صبح اٹھ کر پہلا کام یہ کیا کہ اسکول کے پرنسپل صاحب کو فون کر دیا اور حسب وعدہ اسکول نہ پہنچ سکنے کی معذرت کی۔ انہوں نے بڑے اخلاق سے میری معذرت قبول کرتے ہوئے کہا لیجئے ڈاکٹر ظہیر صدیقی صاحب سے بات کریں وہ بھی آفس میں موجود ہیں۔ میں نے بات کی۔ وہ بہت بھرائی ہوئی آواز میں بولے ''میاں تم ٹھیک تو ہو۔ سب خیریت ہے'' میں نے کہا جی ہاں۔ انشاء اللہ کل آؤں گا اس کے بعد وہ کچھ بول نہ سکے اور فون رکھ دیا بعد میں پتہ چلا کہ میں رات کو جس ٹرین سے جانے والا تھا اس کا شاہدرہ پر ایکسیڈینٹ ہو گیا تھا اور تین سو آدمی ختم ہو گئے تھے۔ ظہیر بھائی نے یہ خبر پڑھی تھی اس لئے پریشان ہو کر میرے بارے میں معلومات لینے اسکول پہنچے تھے۔ اور جب تک فون پر مجھ سے بات نہ ہو گئی ان پر مستقل رقت طاری رہی۔ وہ ایسا محبت بھرا دل رکھتے تھے جو زیادہ سے زیادہ محسوس کرتا تھا اور کم سے کم ظاہر کرتا تھا۔ باچنیں ذوق جنوں پاس گریباں داشتم

درجنوں از خود نہ رفتن کار ہر دیوانہ نیست

محبت انکی فطرت، رواداری انکا مسلک صلح جوئی ان کا مزاج اور انکساری ان کا طرۂ امتیاز تھی۔ خاندان کا کوئی چھوٹا یا بڑا مسئلہ ہو ظہیر بھائی کا تبصرہ بے لاگ اور ان کا فیصلہ حقائق پر مبنی ہوتا تھا۔ انکے والد صاحب قبلہ بھی ہر قسم کے معاملہ میں انکی رائے اور مشورہ سے ہی کوئی قدم اٹھاتے تھے۔ وہ اول تو کسی کی برائی کرتے ہی نہ تھے اور اگر کرتے بھی تو براہ راست اور سخت قسم کے الفاظ کا استعمال نہ کرتے۔ ہاں کسی کی کوئی بات اچھی لگتی تو بڑی فراخدلی سے تعریف کرتے۔ ایسا لگتا تھا انکے پاس کسی کی برائی کرنے کو الفاظ کا ذخیرہ نہیں ہے اور تعریفی الفاظ کی فراوانی ہے۔ جب وہ شعبۂ اردو دلی یونیورسٹی کے صدر تھے تب نظام خطبات منعقد کرانے کا انتظام ان کے سپرد ہوا۔ خطبہ کے لئے علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبہ فلسفہ کے پروفیسر ظفر احمد صدیقی صاحب کو مدعو کیا گیا۔ عنوان تھا اقبال کا فلسفۂ خودی۔

ظفر صاحب دہلی تشریف لائے مگر ان کی طبعیت ٹھیک نہیں تھی اور وہ خود دو ڈھائی گھنٹہ تک کھڑے ہو کر خطبہ نہ پڑھ سکتے تھے۔ ظہیر بھائی نے یہ خدمت مجھے سونپی مقالہ میں بکثرت فارسی اشعار اور انگریزی کے اقتباسات تھے۔ میں ذرا گھبرا رہا تھا۔ ظہیر بھائی نے میری بڑی ہمت بڑھائی اور اس کام کے لئے مجھے آمادہ کر لیا۔ مقالہ کے اختتام پر ان کے ایک قریبی ساتھی نے کہا آپ کے بھائی ایران سے ڈاکٹریٹ کر کے لوٹ آئے؟ یہ بہت خوشی کی بات ہے کہ وہاں کا لب ولہجہ بھی حاصل کر لیا۔ ظہیر بھائی بہت محظوظ ہوئے اور انہیں بتایا کہ میرے چھوٹے بھائی ابھی ایران سے واپس نہیں لوٹے ہیں۔ یہ تو میرے چچا زاد بھائی ہیں۔ بعد میں انہوں نے بہت سے لوگوں کو بڑا خوش ہو کر ایرانی لب ولہجہ والی بات بتائی۔

جب میری فیملی بھی دہلی آ گئی تو میں نے شاہدرہ میں رہائش اختیار کر لی مگر برابر ان سے ملنے تیمار پور جاتا رہا اور انہیں بھی جب موقعہ ملتا وہ خود آ جاتے۔ پھر قرول باغ اور آخر میں یونیورسٹی کیمپس میں منتقل ہونے کے بعد بھی یہ سلسلہ چلتا رہا۔ وہ اپنی بے پناہ مصروفیتوں کے باوجود عزیزوں اور دوستوں سے ملاقات کی کوئی تقریب نکال ہی لیتے تھے۔ ریٹائر ہو کر جب وہ علی گڑھ میں مقیم ہوئے تو ملاقاتوں کا سلسلہ بہت کم ہو گیا۔ وہ بھی بیمار ہو گئے اور میری صحت بھی پہلے جیسی نہ رہی اور سفر مشکل معلوم ہونے لگا۔

ظہیر بھائی کو ذوق ادب اور شوق سفر شہروں شہروں لئے پھرتا تھا۔ ملک کے کسی کونہ میں اردو کا کوئی پروگرام ہو وہ مدعو کئے جاتے تھے اور وہ لمبے لمبے سفر طے کر کے جاتے بھی تھے۔ جب انکے یونیورسٹی والے فلیٹ میں لگاتار کئی بار جانے پر ان سے ملاقات نہ ہو سکی تو میں نے اُن آپا (مسز ظہیر) سے کہا تھا کہ ظہیر بھائی سے کہئے کہ کبھی کبھی دہلی کا دورہ بھی کر لیا کریں اور ہم جیسے نیاز مندوں کو بھی ملاقات کا موقعہ دیں۔ کیا خبر تھی جس انسان کو ایک شہر سے دوسرے شہر کا سفر کرنا اتنا مرغوب رہا ہو اور ہر وقت اس کے لئے تیار رہتا ہو وہ ایک دنیا سے دوسری دنیا کا سفر بھی اتنی جلدی طے کر لے گا۔ خدا انکی اس منزل کو بھی آسان کرے۔ آمین۔

ہستی سے عدم تک نفسِ چند کی ہے راہ
دنیا سے گزرنا سفر ایسا ہے کہاں کا

غزالہ خالد ہاشمی
نارتھ ناظم اباد، کراچی

میرے ابو

آج سے ٹھیک ایک سال ایک ماہ نو روز قبل کی رات جو یقیناً قیامت صغریٰ کی شکل میں آئی اور میری زندگی کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ گئی۔ سترہ فروری 2002ء کی رات دو بجے کا وقت فون کی گھنٹی بجی۔ اتنی رات میں فون کی گھنٹی کا بجنا گو کہ میرے لئے کوئی نئی بات نہ تھی کیونکہ خالد کی ملازمت ہی ایسی ہے کہ کسی وقت بھی ان کو بلانے کے فون آتے رہتے ہیں اور اس رات بھی تھوڑی دیر پہلے بھی دو ایک گھنٹیاں بج چکی تھیں اور میں صرف اتنی ڈسٹرب ہوئی تھی کہ کروٹ بدلی اور سوگئی مگر جب یہ گھنٹی بجی تو نہ جانے کیوں میں اٹھ کر بیٹھ گئی اور خالد موبائل لے کر کمرہ کے دوسرے سرے کی طرف بڑھ گئے۔ میں کچھ نہ سن سکی مگر اس کے باوجود میرے اندر دھما کہ سا ہوا۔ اور جب خالد نے آکر مجھے یہ خبر سنائی تو میری سکتہ کی سی کیفیت ہو چکی تھی۔ خبر نہیں میں کتنی دیر اسی کیفیت میں رہی۔ جب اس سے باہر آئی تو سب سے پہلی بات جو میرے ذہن میں آئی یہ تھی کہ جب میری کاکا (خالہ جنھوں نے مجھے بیٹی بنایا ہوا تھا) کے انتقال کی اطلاع مجھے ملی تھی تو میں اتنا روئی تھی کہ میری ایک آنکھ کا پردہ ہی متاثر ہو گیا تھا اور مجھے آپریشن کرانا پڑا تھا۔ اس لئے میں نے سب سے پہلے اللہ تعالیٰ سے یہی دعا کی کہ وہ مجھے صبر کی طاقت دے تا کہ ابو کی مغفرت کے لئے قران شریف پڑھنے میں رکاوٹ نہ آئے۔ اللہ نے یہ دعا قبول کی۔

ماں باپ میں سے کسی کا سایہ سر سے اٹھ جانا کسی بھی انسان کے لئے ایسا خلاء

ہوتا ہے جسے کوئی نہیں بھر سکتا۔ والدین کی محبت اور شفقت کچھ اس طرح کی ہوتی ہے کہ اسے کسی ایک لفظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اور میرے والدین بھی ایسے ہی محبت اور شفقت کا مجموعہ ہیں۔ ایک بات کی اور وضاحت کرتی چلوں کہ میں لکھنے تو ابو کے متعلق جا رہی ہوں مگر میں اپنی امی کو بھی ان سے الگ نہیں کر سکتی کیونکہ ابو کی زندگی کے کسی بھی پہلو کا ذکر امی کے ذکر کے ساتھ ہی مکمل ہوتا ہے۔ دونوں میں سے کسی ایک کی ناراضگی (گو کہ اس کا تجربہ بہت کم ہوا ہے) دل میں اس بات کا ڈر پیدا کر دیتی تھی کہ اب دوسرا بھی ناراض ہو جائے گا۔ کہیں جانے کی اجازت لینا ہے تو ابو سے پوچھنے پر جواب ملتا کہ اگر امی نے اجازت دے دی ہے تو چلی جاؤ۔ امی سے کسی بات کی اجازت طلب کرتی تو ان کا بھی جواب یہ ہوتا کہ ابو نے کہہ دیا ہے تو کر لو محبتیں، لاڈ پیار کچھ اس طور ملتے رہے کہ چھوٹے سے بڑے ہونے کا احساس ہی نہ ہوا۔ یہ پتہ ہی نہ چلا کہ کس طرح پانچ چھ سال کی وہ بچی جو اپنے ابو کے دہلی سے علی گڑھ آنے پر دوڑ کر ان کے گلے میں لٹک جاتی تھی اسی طرح ان کی بانہوں میں جھولتے جھولتے بی اے اور ایم۔ اے کی طالبہ بن گئی۔ لیکن جہاں ایسا لاڈ پیار تھا وہاں ساتھ میں روک ٹوک اور نصیحتیں بھی شامل ہوتی تھیں۔ اور وہی نصیحتیں اور ان کا عملی نمونہ خود ان کی ذات آج میری زندگی میں مشعل راہ بنی ہوئی ہیں۔

ہم جب بھی کھانے کی میز پر اکٹھے ہوتے تو ابو اتنی اونچی آواز میں بسم اللہ پڑھتے کہ ہم سب کے کانوں میں پڑ جائے۔ کھانے کے دوران ایک جملہ ہم سے ضرور کہتے ''بچو اللہ کا شکر ادا کیا کرو کہ اس نے یہ ساری نعمتیں رزق حلال کی شکل میں دیں''۔

میں اکثر سوچتی ہوں کہ ابو جو دیکھنے میں بہت زیادہ مذہبی نہیں لگتے تھے ان کے نہ جانے کتنے اعمال و افعال اتباع رسولؐ کے آئینہ دار تھے۔ میں نے ان کو کبھی سخت اور اونچی آواز میں بات کرتے نہیں دیکھا۔ کبھی ان کی زبان پر کوئی چھوٹے سے چھوٹا برا لفظ بھی نہیں آیا۔ کسی کی بات سے کتنی بھی تکلیف کیوں نہ پہنچے، وہ غصہ کا اظہار یا بدلہ لینے کے بجائے بس اتنا کہہ دیتے کہ ''اللہ انہیں نیک ہدایت دے'' میرا مشاہدہ ہے کہ شریف گھرانوں میں عورت • بالخصوص بیوی کو اچھا مقام دیا جاتا ہے۔ لیکن جو عزت دیتے میں نے ابو کو دیکھا وہ

© ڈاکٹر مسز افتخار بیگم صدیقی

کتاب	:	باتیں ہماریاں
تالیف	:	ڈاکٹر مسز افتخار بیگم صدیقی
سرورق	:	طارق صدیقی
اشاعت	:	۲۰۰۴ء
طباعت	:	مسلم ایجوکیشنل پریس، بنی اسرائیلان علی گڑھ۔ فون نمبر 2522887
قیمت	:	-/175 (ایک سو پچہتر روپے)
تعداد	:	200

ملنے کا پتہ

ڈاکٹر مسز افتخار بیگم صدیقی

افتخار منزل بدر باغ، علی گڑھ۔

فون نمبر: 91-571-2702475

موبائل: 9412731490

E - mail: tttariq@hotmail. com

ظہیر احمدؒ صدیقی اپنے صدر پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کے ساتھ

رسول اکرمؐ کی سنت کا عملی نمونہ ہے۔

کسی بھی طرح کا لڑائی جھگڑا خواہ کسی کے درمیان ہوابو کو تکلیف پہنچاتا اور حتی المقدور صلح کرانے کی کوشش کرتے۔ اور اکثر کامیاب بھی ہو جاتے اور اگر گھر میں یا کسی بہن بھائیوں کے درمیان کوئی ناچاقی یا جھگڑا دیکھتے تو آزردہ خاطر ہو جاتے۔ اس پر بہت تکلیف کا اظہار کرتے اور ہم بچوں سے مخاطب ہو کر کہتے کہ اللہ کا احسان ہے کہ تم سب میں آپس میں بہت محبت اور اتفاق ہے۔ ایک دن مجھ سے باتیں کرتے ہوئے کہنے لگے ''بیٹی: بہن بھائیوں میں تم سب سے بڑی ہو اس لئے ہمارے بعد یہ تمہاری ذمہ داری ہے کہ تم اپنے بہن بھائیوں کی محبت کا شیرازہ بکھرنے نہ دو''۔ میں ان سے یہ نہ کہہ سکی کہ ابو آپ بہت بڑی ذمہ داری مجھے سونپ رہے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ کے حضور اکثر یہ دعا کرتی رہتی ہوں کہ ہم بہن بھائیوں میں جو محبت ہے وہ ہمیشہ قائم رہے۔ اس میں اور اضافہ کر اور میں اپنے ابو کے سامنے شرمسار نہ ہوں۔ اس کے علاوہ ابو اپنی کسی خوشی، کسی نعمت، کسی اعزاز کے ذکر کے ساتھ اللہ کا شکر ضرور ادا کرتے تھے۔ کوئی مسئلہ درپیش ہوتا تو بڑے بھروسہ اور یقین کے ساتھ ''اللہ صاحب'' کے سپرد کر دیتے۔ اور اللہ صاحب انکو درپیش مسئلہ کو حل کر دیتے۔

آج جب ابو کے بارے میں لکھنے کو قلم اٹھایا ہے تو چھوڑنے کو دل نہیں چاہ رہا ہے۔ مگر مجبوری ہے کہ الفاظ میرے جذبات کی ترجمانی سے قاصر ہیں۔

مجھے یاد ہے جب مجھے ابو کے انتقال کی اطلاع ملی تو ایسا لگا کہ میں جس مضبوط سایہ دار دیوار کے سہارے زندگی گزار رہی تھی اور جس کے سایہ نے مجھے زندگی کے نشیب و فراز اور حالات کی آندھیوں سے نبرد آزما ہونے کی ہمت و صلاحیت دی تھی وہ آدھی ڈھے گئی ہے۔ مگر ساتھ ہی اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں کہ بالکل بے سہارا تو نہیں ہوں۔ جو سہارا میرے پاس ہے وہ بھی کچھ کم مضبوط تو نہیں۔ اللہ تعالیٰ اس سہارے کو ہمارے سر پر قائم و سلامت رکھے۔ میں لکھ چکی ہوں کہ میں نے ابو اور امی کو کبھی الگ کر کے نہیں دیکھا ہے تو اب بھی امی کی شخصیت میں ابو کے وجود کو تلاش کرنے کی کوشش کیوں نہ کروں۔

☆☆☆

بشریٰ خالد
کراچی۔

اونانا

او نانا ،او نانا۔ جب تم گھنٹہ گھر جانا
گول گول رس گلے لانا

مجھے یاد نہیں کہ یہ نرسری رایم میں نے خود سے کہیں سن کر یاد کر لی تھی یا پھر کسی نے یاد کروائی تھی۔ البتہ اتنا ضرور کہہ سکتی ہوں کہ یہ ان کے بارے میں میری بالکل ابتدائی یادوں میں سے ایک ہے۔ میں اپنے اس مضمون میں ایسی ہی چند یادوں کا تذکرہ کروں گی جو میرا قیمتی سرمایہ ہیں۔

میرے نانا ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی جو مزاجاً بہت زندہ دل اور بے تکلف انسان تھے انہوں نے ہم بچوں سے خود کو نانا کی جگہہ ابو کہلوایا حالانکہ نانی کو ہم نے ہمیشہ نانی ہی کہہ کر پکارا۔ پھر کبھی زیادہ پیار اور بے تکلفی کے اظہار کے لئے میں انہیں ابو کی جگہہ ابوا کہنے لگتی تھی۔ تب وہ اور بھی خوش ہوتے تھے۔

سوچنے بیٹھوں تو ایک well maintained اسکوٹر چرچل اسٹائل کی ہلکی سی مونچھ اور ایک دھیمی سی مگر دنیا کی سب سے خوبصورت مسکراہٹ ذہن کے پردہ پر ابھر آتی ہے۔ اس کے علاوہ لاکھ کی مہر لگا کر لفافے بند کرنے کا دلچسپ کھیل جو وہ روزانہ کھیلا کرتے تھے۔ جس کو ہم بچے بڑے شوق اور تجسس سے دیکھا کرتے تھے اور جب کام پورا ہو جاتا تو

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

پھونک مار کر موم بتی بجھانے کا کام بچوں سے کرواتے۔

ان کا آرام سے لیٹ کر بالوں میں کنگھا کروانا، ساتھ ہی ہم بچوں کے ساتھ بالکل بچکانہ چہلیں کرنا، کم باتیں اور بہت سا پیار یہ تمام باتیں ابو سے متعلق میری بیش قیمت یادوں میں شامل ہیں۔ ذرا آگے چل کر ان کے ساتھ مشاعروں اور ادبی نشستوں میں جانا اور وہاں وقفوں کے دوران دوسرے بچوں کے (بلکہ بڑوں کے بھی) ساتھ بچکانہ جوش کے ساتھ پاکستان کی حمایت میں بحثیں کرنا، کسی مقابلہ میں انعام حاصل کرنے پر شاباشی اور دعائیں۔ پہلی بار اپنے ہاتھ کی پکی کوئی چیز کھلانے پر تعریف کے بھر بھر ٹوکرے وصول کرنا چاہے وہ چیز کیسی ہی بے مزہ کیوں نہ ہو VII گریڈ میں مجھے ایک مضمون لکھنے کو دیا گیا تھا۔ عنوان تھا ''میری پسندیدہ شخصیت''۔ مجھے شخصیت کے انتخاب میں کوئی مشکل نہیں پیش آئی کیونکہ میری ڈائری (ڈائری لکھنے کا شوق بھی ابو کو دیکھ کر ہوا) گواہ تھی کہ میری پسندیدہ شخصیات میں رسول اکرمؐ کے بعد ابو کا نام آتا ہے۔ انکی جس خصوصیت نے بچپن میں مجھے غیر ارادی طور پر اور سمجھ آنے کے بعد شعوری طور پر ان کا مداح بنایا وہ انکی انسان دوستی، تحمل، اور معاف کر دینے کی بے پناہ طاقت تھی۔ یہ وہ خصوصیات ہیں جو اپنے آس پاس کیا دور دور تک ڈھونڈے نہیں ملتیں۔

میرے اندر پڑھنے اور شاعری کا شوق نانی نے پیدا کیا اور پڑھنے کے لئے مواد کی فراہمی ابو کے توسط سے ہوئی۔ وہ انڈیا سے آتے تو میرے لئے کتابیں لاتے اور پاکستان میں انہیں جو تحفے کتابوں کی شکل میں ملتے ان میں جو میری دلچسپی کی ہوتیں مجھے دے دیتے۔ اردو زبان کے روشن مستقبل، خصوصاً انڈیا میں اردو کی حالت کے بارے میں ان کا جوش و خروش سننے والوں کے دلوں کو بھی گرماتا تھا۔ وہ مایوس ہونا جانتے ہی نہیں تھے اور محنت، خلوص اور اپنے کام سے محبت اور لگن ان کا ایک اور وصف تھا جس سے ہماری نسل محروم ہے۔

ابو اور نانی جب بھی پاکستان آتے تو ابو کا زیادہ وقت گھر کی بجائے اپنے دوستوں اور پرانے واقف کاروں سے ملنے میں گزرتا مجھے اور سب بچوں کو یہ بہت برا لگتا تھا۔ یہی

نہیں بلکہ جب ہم انڈیا جاتے تب بھی انکی اپنی مصروفیات ہوتی تھیں اور باہر کے سفر پر بھی جاتے رہتے تھے اس لئے ان کے ساتھ بہت زیادہ وقت گزارنے کا موقعہ تو نہیں ملا مگر قلبی تعلق قائم رہا۔ میں نے ان سے شاید اتنی باتیں نہ کی ہوں جتنا ان کو دیکھا، سمجھا اور محسوس کیا ہے۔ میں 1997ء میں اپنے ماموں کی شادی پر انڈیا گئی تھی۔ وہ ابو کی بیماری کا ابتدائی دور تھا۔ وہ خاموش زیادہ رہنے لگے تھے اور تھکے سے دکھائی دیتے تھے۔

ان سے آخری ملاقات 2000ء میں ہوئی جب وہ اور نانی پاکستان آئے تھے۔ انکی بیماری اس وقت بہت بڑھ چکی تھی۔ یادداشت جواب دینے لگی تھی۔ خوش مزاجی کی جگہ ایک افسردگی سی طاری ہوگئی تھی خوراک کم ہوگئی تھی اور کھانا کھانے سے گھبراتے تھے۔ کہیں جانا آنا بھی چھوڑ دیا تھا اور زیادہ وقت گھر میں ہی گزارتے۔ اس کے بعد ان کے بارے میں جو بھی سننے میں آتا رہا اس پر نہ میں سوچنا چاہتی ہوں نہ اسے دوہرانا چاہتی ہوں۔

جانے دنیا میں اب ایسے لوگ پیدا ہی نہیں ہوتے یا پھر ہم ان کو ڈھونڈ نہیں پاتے۔

☆☆☆

فراز ہاشمی
کراچی

میرے نانا

گو کہ لکھنے لکھانے کے فن سے میں ناواقف ہوں اور میرا میدان ادب نہیں بلکہ سائنس ہے لیکن جب اپنے نانا پروفیسر ظہیر احمد صدیقی کے بارے میں اپنے احساسات قلمبند کرنے کا مجھے موقعہ ملا تو میں خود کو لکھنے سے نہ روک سکا۔ ویسے مجھے یقین ہے کہ جب میں ان کی شخصیت کو الفاظ میں ڈھالنے کی کوشش اور جسارت کروں گا تو یہ تحریر خود بہ خود دلکش ہو جائے گی۔

گو کہ میں اپنے نانا (میں انہیں ابّو کہتا تھا اس لئے آگے ابو ہی کہہ کر ذکر کروں گا) کے ساتھ زیادہ وقت نہ گزار سکا کیونکہ حالات کی مجبوریاں ہمارے درمیان حائل رہیں لیکن جب کبھی اپنے تخیل میں ان کے تصور کو مجسم کیا کرتا ہوں تو ان کی شخصیت کے دو پہلو بہت واضح نظر آتے ہیں اور یہ دونوں پہلو ہی بہت مکمل و خوبصورت ہیں۔

ان کی شخصیت کا اہم ترین پہلو ان کی ادب دوستی اور علمی لگن ہے۔ ادب ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ ادب ان کی عبادت تھا اور ادب انکی ذہنی غذا تھی۔ میں ادب سے زیادہ واقفیت نہیں رکھتا لیکن جب بھی ذہن میں ادب کا تصور آتا ہے اور وہ ایک مجسم شکل اختیار کرتا ہے تو میرے ذہن کے آئینہ پر ابو ہی کی تصویر ابھر آتی ہے۔ انہوں نے ایک بھرپور زندگی گزاری جس کا بیشتر حصہ ادب کی تحصیل اور خدمت میں صرف کیا۔

انکی گھریلو زندگی انکی ادبی زندگی سے بھی زیادہ بھرپور تھی اور خوبصورت بھی۔ یہ ان کی زندگی کا دوسرا روشن پہلو تھا۔ اس پہلو پر شاید میں بھی اپنے احساسات کو کچھ بہتر طور پر قلمبند کرسکوں گا کہ مجھے بھی کچھ وقت ان کے ساتھ گزارنے کا موقعہ حاصل رہا ہے اور انکی محبت وشفقت کا میں بھی حصہ دار رہا ہوں۔

بطور خاندان کے سربراہ کے اتنا سلجھا ہوا اور متحمل شخص کم سے کم میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔ اور اب جو نئی نسل (بشمول میرے) آرہی اس میں بھی ابو جیسی شخصیت میں آیندہ زندگی میں بھی نہیں ڈھونڈھ پاؤں گا۔ محبت ان کی زندگی کا وہ قیمتی اثاثہ تھی جو وہ اپنے اردگرد ہر کسی کو بغیر کسی تفریق اور بنا کسی تخصیص اس بے غرضی سے بانٹا کرتے تھے کہ کوئی بھی ان سے محبت کئے بغیر رہ نہیں پاتا تھا۔ اور رشتوں کے بارے میں تو صرف اندازہ ہی لگا سکتا ہوں لیکن بہ حیثیت باپ کے ان کا جو غیر معمولی مشفقانہ رویہ تھا اس کے بارہ میں بڑے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اس کی مثال ملنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے کیونکہ ان کے نواسہ کی حیثیت سے مجھے بھی ان کی محبت وشفقت سے بہت کچھ ملا ہے۔ جب میں اپنی امی سے ان کے بارہ میں کچھ سنتا ہوں تو امی کی آنکھوں کی چمک اور خوشی اور چہرہ کی طمانیت کا احساس ان کے اس ماضی کے وہ تمام اوراق کھول کر دکھا دیتا ہے جو انہوں نے اپنے والد کے ساتھ ان کی محبت کی چھاؤں میں گزارا تھا اور میرے دل میں یہ خواہش بہت زور پکڑ جاتی ہے کہ کاش میں ابو کا بیٹا ہوتا اور مجھے بھی اس خوشی اور طمانیت میں سے حصہ مل جاتا جو میرے امی کے مقدر میں آئی۔

برداشت اور تحمل ابو کی شخصیت کا خاصہ تھی۔ میں نے کبھی ان کو غصہ کرتے نہیں دیکھا۔ نہ جانے ان کو غصہ آتا ہی نہیں تھا یا وہ اس کو اپنی شفقت اور خوش مزاجی پر حاوی نہ ہونے دیتے تھے۔ معاملہ گھر کا ہو یا باہر کا میں نے انہیں ہر معاملہ بڑی بردباری سے نمٹاتے دیکھا ہے۔

شاید ان کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ لکھنے کی مجھ میں ہمت نہیں ہے کہ ان

کی شخصیت کو جتنا کھوجتے جائیں اسکی سحر انگیزی میں اسی قدر کھوتے چلے جاتے ہیں۔ میرا قلم بھی اب میرا ساتھ نہیں دے رہا ہے اور تحریر بھی دھندلاتی جارہی ہے۔ بس اس خواہش اور امید کے ساتھ ختم کرتا ہوں کہ ابو بے شک ہمارے بیچ میں نہیں ہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ یہاں سے کہیں بہتر جگہہ پر ہوں گے جوان کے شایان شان ہوگی اور بہت خوبصورت بھی ہوگی کیونکہ انکی زندگی بھی ان ہی خوبصورتیوں کا عکس تھی۔

☆☆☆

سمن انیس
بی ایس سی فرسٹ ایر
ویمنس کالج۔علی گڑھ

چھوٹے دادا

کچھ ہستیاں ایسی ہوتی ہیں جو ہمارے بیچ نہ ہونے کے باوجود اپنے ہونے کا احساس دلاتی رہتی ہیں اور اپنے اخلاق اور خلوص سے ماحول کو کچھ اس طرح متاثر کر جاتی ہیں کہ لوگ ان کے گرویدہ ہو جاتے ہیں اور تا عمر انہیں بھول نہیں پاتے۔

میرے دادا رفیق احمدؒ کے چھوٹے بھائی ظہیر احمد صدیقی یعنی میرے چھوٹے دادا بھی ایسی ہی قابل ذکر شخصیت کے مالک تھے۔ان کی پوری زندگی ہی بہترین اصولوں کا مجموعہ تھی۔والدین کی لائق اور ہمدرد اولاد کہ کسی بھی قسم کی پریشانی ہو ان کے والد صاحب (جنھیں وہ ہمیشہ قبلہ کے لفظ سے یاد کرتے تھے) ان سے ہی مشورہ کرتے تھے۔ایک بار ان کو ہائی بلڈ پریشر کی وجہ سے ڈاکٹر نے نمک کھانے سے منع کر دیا تو چھوٹے دادا نے بھی بغیر نمک کا کھانا شروع کر دیا۔انکی وجہ سے ایک نمک دانی دسترخوان پر رکھ دی جاتی تھی مگر انہوں نے اس کو بھی ہٹوا دیا کہ والد صاحب بھی کہیں اپنے آگے نمک نہ ڈال لیں۔وہ صرف والدین کا اور اپنے بزرگوں ہی کا احترام نہیں کرتے تھے بلکہ کبھی ان کے منہ سے کسی کے لئے نازیبا الفاظ سننے کا اتفاق نہیں ہوا۔یہی وجہ ہے کہ وہ چھوٹوں اور بڑوں سب میں یکساں ہر دلعزیز تھے۔ہم نے گھر کے بڑوں اور خود ان کے منہ سے سنا کہ وہ بچپن میں کھیل میں بھی انصاف پرست بادشاہ بنتے تھے۔اکثر جب وہ اپنے بھائیوں اور دوسرے بچوں کے ساتھ

بادشاہ، وزیر اور چور سپاہی کا کھیل کھیلتے تو بادشاہ انہیں کو بنایا جاتا۔ گھر کے وسیع و عریض آنگن میں ایک آواز بلند ہوتی کہ ''بادشاہ سلامت تشریف لاتے ہیں''۔ اور چند لمحوں میں صدر دروازہ سے چھوٹے دادا سر پر اونچی ترکی ٹوپی پہنے داخل ہو جاتے۔ اس طرح کے کھیلوں کے ساتھ ساتھ انہوں نے سیدھے پن میں بھی سب کو مات کر دیا تھا۔ ایک بار کرسی پر سزا کے طور پر بندھے ان کے بڑے بھائی نے انہیں بلا کر کہا کہ دیکھو ہم ایک کھیل کھیل رہے ہیں۔ تم ہمیں کھول کر ہماری جگہ بیٹھ جاؤ ہم چور ہیں تمہیں کرسی سے باندھ دیں گے۔ تم آواز لگانا پولس پولیس تو پولیس آ کر تمہیں کھول دے گی۔ اسطرح وہ تو آزادی پا کر بھاگ گئے اور چھوٹے دادا پولیس کو آوازیں لگاتے رہے یہاں تک کہ والد صاحب نے آ کر انہیں کھولا۔ ایک یہی واقعہ نہیں ایسے کتنے ہی واقعات ہیں جو انکی اس خصوصیت کو ظاہر کرتے ہیں۔

میں بہت چھوٹی تھی جب میرے دادا رفیق احمد میکش بدایونی کا انتقال ہو گیا تھا اس لئے انکی تو زیادہ باتیں مجھے یاد نہیں لیکن چھوٹے دادا سے ہمیں جو پیار ملا اسے ہم کبھی نہیں بھول سکیں گے اور ہم سب بچے بھی ان کو اتنا ہی چاہتے تھے۔ وہ دہلی میں رہتے تھے لیکن اکثر علی گڑھ آنا رہتا تھا۔ یہاں انکی توجہ کا مرکز گھر کے بچے ہوتے تھے جو ان سے بڑی بے تکلفی سے چپٹے رہتے تھے اور وہ ہم بچوں کے بیچ دلی والے دادا کے نام سے مشہور تھے۔ تھری پیس سوٹ میں ملبوس ہاتھ میں چھوٹا سا اٹیچی اور چہرہ پر ایک بے ساختہ سی مسکراہٹ لئے وہ آتے دکھائی دیتے اور سب بچوں میں ''دلّی والے دادا آ گئے'' کا ایک نعرہ بلند ہوتا۔

کچھ یادیں اور کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو کبھی بوڑھی نہیں ہوتیں چاہے انہیں کتنا ہی وقت کیوں نہ گزر جائے۔ مجھے آج بھی گرمیوں کی وہ خشک دوپہریں یاد ہیں جب چھوٹے دادا کسی میٹنگ یا سیمینار سے واپسی میں علی گڑھ رک جاتے۔ ان کے ساتھ گزرے ان چند دنوں میں ہمیں بے حد مزہ آتا تھا۔ سب گھر والوں اور بڑے لوگوں سے ملنے کے بعد ان کا خاص مشغلہ یہ ہوتا تھا کہ بڑے کمرہ کے بڑے پلنگ پر لیٹ جاتے تھے اور ہم سب بچے ان کے چاروں طرف بیٹھ جاتے۔ بچے ان کے بستر کو کچل ڈالتے۔ کوئی ان کے قریب بیٹھ کر سر میں مالش کر رہا ہے۔ کوئی ہاتھ دبا رہا ہے، کوئی انگلیاں چٹخا رہا

ظہیر احمد صدیقی دہلی کے لیفٹیننٹ گورنر مسٹر کپور کے ساتھ دہلی اردو اکیڈمی کا انعام لیتے ہوئے۔

ہے۔ ماچس کی جلی اور بغیر جلی تیلیوں سے انکی پیٹھ پر کھدائی کر کے کھیتی باڑی کی جا رہی ہے۔ مگر کبھی بھی انہوں نے کسی بچے سے پیر نہیں دبوائے اور یہ ثابت کر دیا کہ آپ بڑوں کی عزت تو کرتے ہی تھے لیکن اپنے چھوٹوں، خصوصاً بچیوں کی بھی بہت عزت افزائی کرتے تھے اور کبھی بھی کسی لڑکی کو کوئی بھاری کام نہیں کرنے دیتے تھے۔ ایسے ہی دلچسپ ماحول میں وہ کہانی اور لطیفے سناتے رہتے اور سوال بھی پوچھتے جاتے۔ ایک سوال یہ بھی ضرور ہوتا کہ معلوم ہے میں یہاں کیوں آیا ہوں۔ تمہیں کہانی سنانے اور پیٹھ پر کھیتی کروانے۔ انکی یہ ذرا سی بات ہماری خوشیوں میں مزید اضافہ کر دیتی۔ نمائش کے آنے کی یوں تو سب کو ویسے بھی خوشی ہوتی مگر نمائش کے ساتھ جو کبھی دلّی والے دادا بھی آ جائیں تو یہ خوشی دو بالا ہو جاتی تھی۔ وہ ایک بار ضرور سب کو ساتھ لے کر نمائش میں کباب پراٹھا کھلانے لے جاتے گھر کے سارے بچے بڑے ملا کر پوری ایک برات سی بن جاتی مگر وہ بڑے سکون سے ان ہنگاموں کو برداشت کرتے۔

وہ اکثر کہتے تھے۔ ہم نے دو کام بہت کئے ہیں۔ ایک تو سفر اور دوسرے Suffer۔ اگر کسی دعوت کے دوران ان کی تواضع کرتے ہوئے کوئی کہتا کہ تکلف نہ کیجئے اپنا ہی گھر سمجھئے تو کہتے اپنا گھر سمجھتا ہوں اسی لئے تو کم کھا رہا ہوں۔ ہم بچوں سے اکثر ان کا سوال ہوتا بتاؤ تم انیس کے بچے ہو یا عقل کے۔ اور ہم پریشان ہو جاتے کہ کیا جواب دیں۔ ان کی ناک پر ایک ہلکا سا نشان تھا جو یقیناً بچپن کی کسی چوٹ کا نتیجہ تھا۔ مگر ہم میں سے کسی نے جب بھی ان سے اس چوٹ کے بارے میں پوچھا ایک کہانی ہمیں سنا دی گئی کہ ان کی دوستی شاہ جنات سے ہو گئی تھی۔ وہ انہیں ہر چیز لا کر دیتا ہے اور اپنے دوستوں کی پہچان کے لئے اس نے یہ نشان چہرہ پر لگا دیا ہے۔ یہ کہانی سن کر ہم سب حیرت میں پڑ جاتے ان باتوں سے انکی پر مذاق اور بے تکلف طبیعت کا پورا اندازہ ہوتا ہے۔

وہ اپنے استادوں کی بڑی عزت کرتے تھے اور ان سے بہت عقیدت سے ملتے تھے۔ اور استاد بھی ان سے بہت محبت سے پیش آتے۔ ان کے اسکول کے استاد سید محمد گونکی کے الفاظ ہیں کہ ''استادوں سے تو سبھی شاگرد متاثر ہوتے ہیں مگر میں اپنے بعض شاگردوں

سے بھی متاثر ہوا ہوں۔ ان میں سرفہرست ظہیر کا نام ہے''۔ خود چھوٹے دادا کا بھی اپنے شاگردوں کے ساتھ یہی حال تھا۔ کوئی ان کے پاس کچھ پوچھنے یا پڑھنے آتا اسے کبھی منع نہ کرتے چاہے وہ کتنے ہی مصروف ہوں سب کے خطوں کے جواب فوراً دینا اور ہر مدد کے لئے تیار رہنا ان کی عادت تھی۔ ایک واقعہ جو خود انہوں نے ہمیں سنایا یہ ہے کہ ایک بار کوئی صاحب ان کے پاس آئے کہ آپ مجھے کچھ وقت دے دیں مجھے آپ سے کچھ پوچھنا ہے۔ اس زمانہ میں انکی مصروفیات کچھ بڑھی ہوئی تھیں اور ایک منٹ بھی نکالنا مشکل تھا مگر انہوں نے انکار نہیں کیا بلکہ کہہ دیا کہ آپ آسکتے ہوں تو صبح سات بجے آجایئے۔ وہ صبح وقت پر حاضر ہو گئے۔ دادا انہیں ساتھ لے کر بس اسٹاپ تک گئے۔ راستہ میں انہیں جو پوچھنا تھا پوچھتے رہے اور دادا سمجھاتے رہے۔ پھر بس آگئی اور وہ کالج سے یونیورسٹی تک کے راستہ میں تقریباً ایک گھنٹہ انہیں پڑھاتے رہے۔ وہ اکثر دوپہر میں اپنے آرام کے وقت میں بھی شاگردوں کو بلا لیا کرتے تھے۔ اس طرح کے واقعات ہمیں وہ اپنی بڑائی کے طور پر نہیں سناتے تھے بلکہ ان شاگردوں کے ذوق وشوق کی مثالیں دینے کے لئے سناتے تھے۔ اردو سے انہیں شروع ہی سے بہت دلچسپی تھی اور لکھنے لکھانے کا شوق تھا اس لئے وہ اپنے ساتھیوں میں ''علامہ'' کہلاتے تھے بلکہ اس کا ایک لطیفہ بھی انہوں نے سنایا۔ ایک بار ان کے اسکول کے کوئی ساتھی گھر پر ملنے آئے۔ باہر لان میں ان کے والد صاحب بیٹھے تھے۔ ان ساتھی نے پوچھا کیا علامہ گھر پر ہیں۔ والد صاحب نے کہا کون علامہ۔ یہاں تو کوئی علامہ نہیں ہیں۔ اتنے میں چھوٹے دادا آواز سنکر باہر نکل آئے۔ تب والد صاحب کو پتہ چلا کہ علامہ کس کو کہا جارہا ہے۔

جن لوگوں کو ان سے پڑھنے اور فیض اٹھانے کا موقعہ ملا ہے ان کی بہت بڑی تعداد ہے۔ لیکن ان کی شخصیت اور اصولوں سے خاندان کے بچوں نے بھی کچھ نہ کچھ اثر قبول کیا ہے اور انکی کہی ہوئی باتوں کو اپنے لئے مشعل راہ بنایا ہے۔ ان کے ایک مضمون کا یہ جملہ ہمارے لئے ہدایت کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

''ایک بات جو میں اپنے بعد آنے والی نسل سے کہنا چاہتا ہوں یہ ہے کہ زندگی میں اسی وقت توازن پیدا ہوگا جب ہمارے نوجوان خدا پر بھروسہ اور اپنے پر اعتبار کرنا سیکھیں گے''۔

تعارف وتبصرے

پروفیسر رشید احمد صدیقی
صدر شعبہ اردو، مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ

مقدمہ و شرح۔ قصائد مومن

قصائد کا دور اٹھ چکا ہے یا نہیں۔ یا بہ حیثیت قصیدہ نگار مومنؔ کا دوسرے قصیدہ نگاروں میں کیا درجہ ہے یہ بحث آپ کو آئندہ صفحات میں مل جائے گی۔ اس لئے ان امور پر مجھے کچھ کہنا نہیں۔ کہنا یہ ہے کہ ظہیر احمد صدیقی صاحب نے مومن کے قصائد کی شرح لکھ کر ان طالب علموں پر بڑا احسان کیا ہے جن کو امتحان کا ہفت خواں طے کرنے کے لئے ان قصائد سے سابقہ ہوتا ہے۔ غزل، مثنوی اور قصیدہ اردو شاعری کی بہت اہم اصناف ہیں اور اس وادی کے ایک سے ایک مشہور و مستند امام گزرے ہیں۔ لیکن اب زمانہ ایسا آ گیا ہے اور اردو ایسے نازک دور سے گزر رہی ہے کہ ان اماموں سے واقفیت، ان کے فن پاروں کو سمجھنے اور ان سے لطف اٹھانے کی صلاحیت روز بروز تیزی سے کم ہوتی جا رہی ہے۔

غزل سے لطف اٹھانا نسبتاً آسان ہے۔ مثنوی کی رواں اور مترنم بحر، اس کی زبان، اور اس کا قصہ مزہ دے جاتے ہیں۔ لیکن قصیدہ کا سمجھنا اور اس کی قرار واقعی داد دینا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ فن شکل زبان مشکل، معنی مطلب مشکل وہ فضا جس میں قصیدہ نمو پاتا تھا اور رنگ دکھاتا تھا وہ سرے سے مفقود۔ پھر قصیدہ کے ساتھ کون انصاف کرے اور کیسے کرے۔ شاعری میں میرے نزدیک قصیدہ استادوں کا فن ہے۔ استاد سے کم درجہ کے شخص کا اس وادی میں گزر نہیں۔ یہی نہیں بلکہ قصیدہ کے سمجھنے کے لئے بھی تھوڑی سی لیاقت درکار ہوتی ہے۔

قصیدہ نگار کے لئے ممدوح ایک بہانہ ہے جس کی آڑ لے کر وہ اپنے فن کا کمال دکھاتا ہے۔ ممدوح بھی یہ نہیں سمجھتا کہ لفظاً اور معناً ساری ثناوصفت اس پر صادق آتی ہے۔ وہ اپنی بڑائی سن کر نہیں بلکہ شاعر کے کمال فن پر انعام دیتا ہے اور اس کی قدر کرتا ہے۔ اس سے ان قصیدہ نگاروں کی جواب دہی مقصود نہیں ہے جن کے قصائد کسی اعتبار سے قابل اعتنا نہیں ہوتے میرا مقصد تو صنف قصیدہ سے ہے جو زور بیان کے نمونے پیش کرتا ہے آج تک کسی قصیدہ سے کسی ممدوح کا درجہ بلند نہیں ہوا۔ لیکن اس قصیدہ کا ہوا جو ممدوح کی شان میں لکھا گیا اور اس شاعر کا ہوا جس نے وہ قصیدہ تصنیف کیا تھا۔ اس سے کیا ثابت ہوتا ہے؟

مگر یہ قصہ تو یہاں ضمناً چھڑ گیا۔ کہنا دراصل یہ تھا کہ طالب علموں کو قصیدہ کے معنی مطلب سے آشنا کرانا۔ آج کل کے معلموں کے لئے بڑا دشوار ہو گیا ہے اس لئے کہ خود ان میں سے بیشتر کی استعداد ایسی نہیں ہوتی کہ وہ داخل نصاب قصائد کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔ ان دشواریوں کے پیش نظر ظہیر احمد صدیقی یقیناً ہماری تحسین کے مستحق ہیں کہ انہوں نے مومن کے قصائد کی مستند شرح لکھی۔ مستند اس لئے کہتا ہوں کہ ان کے پیش نظر وہ شرحیں بھی رہی ہیں جو ان کے والد محترم پروفیسر ضیاء احمد صاحب بدایونی نے وقتاً فوقتاً تصنیف فرمائی ہیں۔ فارسی اور اردو ادب پر بالعموم اور مومن کے جملہ اصناف کلام پر بالخصوص مولانائے ممدوح کی جو نظر ہے اور ان پر جتنا کام موصوف نے کیا ہے وہ میری ہی نہیں میرے جیسے بہت سے دوسروں کی بھی تعریف و تعارف سے مستغنی ہے۔ طالب علموں کو اردو کے بعض اچھے اور بڑے شاعروں سے روشناس کرانے اور ان کو امتحان کی آزمائش سے بخیر و خوبی گزر جانے کے لئے اب تک ظہیر صاحب نے جو تصنیفی خدمات انجام دی ہیں جن میں سے یہ ایک ہے، وہ ہر اعتبار سے قابل توصیف ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر وہ اسی شغل کو اپنا لیں کہ اردو شعر و ادب کے عالی مقام فن کاروں کو بطریق احسن روشناس کراتے رہیں تو یہ ایک ایسا مبارک و مستحسن کام ہوگا جو شاید اب تک ہمارے یہاں کوئی نہیں کر سکا ہے۔

☆☆☆

پروفیسر ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی
صدر شعبہ اردو،
دہلی یونیورسٹی، دہلی۔

مومن شخصیت اور فن

غضب ہے کہ مومنؔ جس کے ایک شعر پر غالبؔ اپنا پورا دیوان نچھاور کرنے کو تیار تھے ان پر ابھی تک کوئی مبسوط کام نہیں ہوا۔ عزیز گرامی ظہیر احمد صدیقی صاحب پہلے شخص ہیں جنہوں نے مومن پر پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ پیش کیا ہے اور ان کی خدمات کا شاسانہ اعتراف کیا ہے۔ مومن کی تصویر غیر معتبر روایتوں میں اس قدر اٹی ہوئی تھی کہ انکی سیرت کے اصلی خط و خال ہی چھپ گئے تھے اور ان پر تنقید بھی اس سے آگے نہ بڑھ سکی تھی کہ وہ رشک کے بادشاہ یا محذوفات کے ماہر تھے۔

صدیقی صاحب نے مستند مآخذ کی مدد سے مومنؔ اور عہد مومن کا ایک مرقعہ پیش کیا ہے اور ادبی تاریخ میں ان کا صحیح مقام متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا ذوق ادب نہایت شستہ اور تربیت یافتہ ہے ان کی تنقید میں ایک خاص قسم کی شرافت ہے جو ان کو جادۂ صواب سے ہٹنے نہیں دیتی۔ ان کی تحقیق میں ایک خاص بے لوثی ہے جو انہیں مجبور کرتی ہے کہ ایک ایک مآخذ کو پرکھیں اور اس کے بعد اس مواد کو ایک لڑی میں پروئیں۔ ان کا اسلوب بھی شگفتہ ہے اور لب و لہجہ بھی سنجیدہ حقیقت یہ ہے کہ وہ اس قدر دلکش کے ساتھ ادب کے میدان میں آئے ہیں اور انہوں نے اس نقش کی درستگی میں وہ محنت کی ہے کہ ان کی یہ تحقیق مطالعہ مومن ایک خاص امتیاز رکھتی ہے۔

طالب آملی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے اس مصرعہ کے لکھنے میں چھ مہینے صرف کیئے تھے۔

زغارت چمنت بر بہار منت ہاست

اور صدیقی صاحب نے اس مقالہ کے ایک ایک باب پر اس سے زیادہ وقت صرف کیا ہے تب کہیں جا کر اس ادائے خاص سے نکتہ سرائی کی ہے اس میں کچھ تو ان کی مشکل پسند طبعیت کو دخل ہے کچھ ہمارے وسائل کی کمی کو کہ اس کتاب کی اشاعت کا سروسامان دیر میں ہوا اور کچھ میری بدتوفیقی کو کہ اس کا مقدمہ لکھنے میں مجھ سے تاخیر ہوئی لیکن اس تصدیق سے یہ فائدہ ہوا کہ صدیقی صاحب نے تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مواد کا احاطہ کرلیا۔ اور جدید ترین مآخذ کی بھی خوشہ چینی کر لی۔ مجھے یقین ہے کہ ان کی یہ سعی مشکور ہوگی اور مومن کی خدمات کے عدم اعتراف میں جو احسان ناشناسی اور تاریخی وتہذیبی غلطی برتی جارہی تھی اس کی تلافی ہوجائے گی۔

☆☆☆

احسان دانش

نیا پیام، لاہور۔

جذباتِ رضی (واسوخت)۔ مرتبہ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی

یہ واسوخت مولوی رضی احمد صاحب رضیؔ، شررؔ بدایونی کے قلم کا شاہکار ہے جس پر ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی نے بڑی محنت کی ہے اور مقدمہ سے واسوخت کے ہر بند پر روشنی ڈال کر حسنِ شعری کو اور بھی چمکا دیا ہے۔ واسوخت سے علیحدہ ہٹ کر بھی ظہیر صاحب نے بعض بعض باتیں جنہیں مطالعہ کے نوٹس کہا جا سکتا ہے اچھی اور مفید کہی ہیں۔ ایسے مقدمے پڑھ کر اگرچہ کتاب پڑھنے کی ضرورت نہیں رہتی لیکن واسوخت کے شاعر جناب رضیؔ بدایونی کی قابلیت، مطالعہ اور قادر الکلامی کو ضرور سراہنا پڑتا ہے۔ ہر بند میں جو وہ کہنا چاہتے تھے بڑی صفائی اور چابکدستی سے کہہ گئے ہیں جس سے ان کی شاعرانہ مشق و مزاولت کا پتہ چلتا ہے کاش اس قسم کے پوشیدہ خزانے ادب میں آتے رہیں اور انہیں ایسے ہی مقدمہ نگار میسر آتے جائیں۔

آج کے نوجوان واسوخت کو ماضی کی متروک صنف شعر ضرور کہیں گے۔ لیکن یہی لوگ خلوتوں میں ان تمام چیزوں کو پڑھتے اور استفادہ کرتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتو موجودہ تعلیم کسی کو تصنیفی تالیفی شعور ذرا مشکل ہی سے دیتی ہے۔

☆☆☆

احسان دانش

نیا پیام، لاہور۔

دیوانِ دردؔ.....مرتبہ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی

ڈاکٹر ظہیر صدیقی جس مصنف پر قلم اٹھاتے ہیں اس پر اپنی چھاپ لگاتے چلے جاتے ہیں۔ جس سلیقہ سے انہوں نے دیوانِ میر دردؔ کو ترتیب دیا ہے قابلِ داد ہے اصل میں ان کا یہ قلمکاری کا سلسلہ ان کے مطالعہ کا نتیجہ ہے اور شب و روز کی عرق ریزی کبھی ضائع نہیں جاتی۔ انہیں قدرت نے فراخ دلی سے سلیقۂ ترتیب دیا ہے اور اس میں تحقیق کی رنگ آمیزی ان کے مقام کو اور بھی بلند اور تحریر کو اور بھی وقیع کر دیتی ہے۔

دیوانِ دردؔ کے دیباچہ میں جہاں انہوں نے تصوف کی معنویت اور شرح کی طرف توجہ کی ہے وہاں میر دردؔ کی زندگی کو تفصیل سے لکھ دیتے تو عمل سے تصوف جھلک سکتا تھا۔ میرا تجربہ ہے کہ کائنات کا ذرّہ ذرّہ حسن کی ایک دنیا لئے ہوئے ہے صرف ڈوبنے والی نظر کی ضرورت ہے۔ میں جس زمانے میں باغبانی کرتا تھا مجھے شبنم سے بھیگے ہوئے پھولوں کی رگین متحرک معلوم ہوتی تھیں اور آج بھی میں خار و خس میں سرگوشیاں محسوس کرتا ہوں مادیاتی مشاہدہ بڑھتے بڑھتے جب انسانی حدود میں داخل ہو جاتا ہے اور انسانی نقش و نگار کو پڑھنے اور سمجھنے کا وقت آجاتا ہے۔ پھر اس میں عجیب عجیب کرشمہ کاریاں نظر آنے لگتی ہیں جس سے صانع کی طرف توجہ بڑھتی ہے اور مصنوع ایک راستے کے منظر کی حیثیت میں آجاتا ہے۔ شروع شروع میں انسانی حسن سے عشق کا معاملہ خطرے سے خالی نہیں۔ تصوف تو صرف

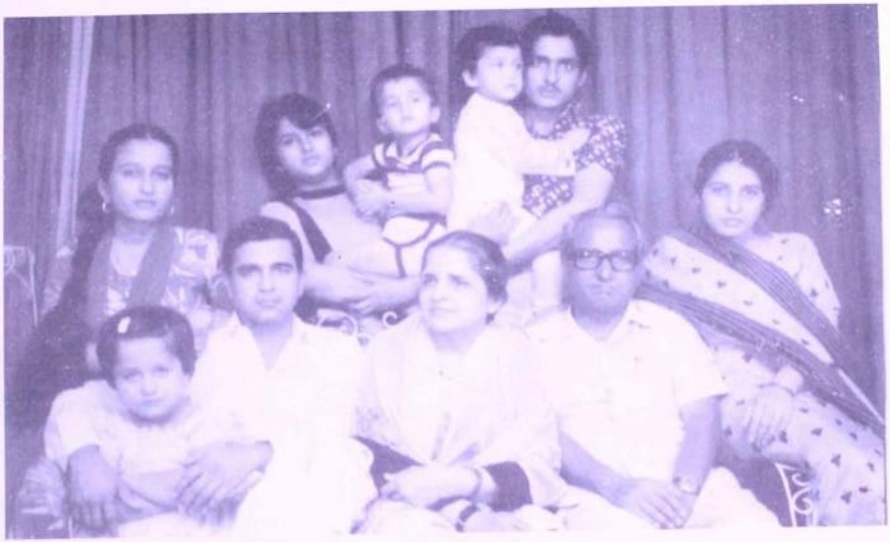

ظہیر صاحب وبیگم ظہیر اپنے داماد کیپٹن خالد ہاشمی بیٹیوں غزالہ (دائیں) شہلا (بائیں) بیٹوں طارق (دائیں) مشیر (بائیں) نواسی بشریٰ خالد عظمیٰ خالد اور نواسہ فراز ہاشمی کے ساتھ۔

مشاہدہ اور مجاہدہ کے کرشموں کا نام ہے جس میں زندگی کے حقائق پردہ اٹھا دیتے ہیں۔

جناب ظہیر نے دیوان درد مرتب کر کے ایک وسیع ادبی خلا کو پر کیا ہے۔ اس صورت میں درد کا دیوان ناپید تھا۔ اب یہ تحقیق کرنے والے طالب علموں کے لئے بھی چراغ راہ ثابت ہوگا اور درد کو سمجھنے میں بھی آسانیاں پیدا کرے گا۔

☆☆☆

سلیمان اطہر جاوید
روزنامہ منصف، حیدرآباد

میرا مطالعہ

کلیات فانی ۔مرتبہ ظہیر احمد صدیقی

فانی کی حیات شخصیت اور شاعری پر اردو تنقید کو اگرچہ مزید توجہ دینے کی ضرورت ہے لیکن اس ضمن میں پروفیسر مغنی تبسم کا کام گرانقدر اور آج تک بے مثال ہے۔ پروفیسر مغنی تبسم نے نہ صرف فانی کی حیات کے بارے میں غیر معمولی تحقیق سے کام لے کر کئی گوشوں کو منظر عام پر لایا بلکہ ان کی سیرت فلسفہ حیات اور تصوف کے بارے میں ان کے خیالات کے سرچشموں کا پتہ چلایا اور گہرے تجزیہ کے بعد ان کو مضبوط انداز مین پیش کیا یہی حال کلام فانی کا بھی ہے۔ ہر چند کہ پروفیسر مغنی تبسم نے کلام فانی مرتب نہیں کیا لیکن ان کے خاصے غیر مطبوعہ کلام کی نشاندہی کی اور بیاض فانی تک رسائی حاصل کی جس کا بیشتر کلام آج بھی فانی کے کسی شعری مجموعہ میں شامل نہیں ہے پروفیسر مغنی تبسم کے اس وقیع کام کے لیے باوصف ضرورت اس امر کی تھی کہ کلیات فانی کا کوئی جامع ایڈیشن شائع کیا جاتا جیسا کہ پروفیسر ظہیر احمد صدیقی نے کلیات فانی مطبوعہ ترقی اردو بیورو نئی دہلی کو مرتب کرتے ہوئے اس دیباچہ میں تحریر کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر تدوین کلیات فانی کا کام مغنی تبسم صاحب انجام دیتے تو کلیات کے حسن میں اضافہ ہو جاتا''۔اس میں کوئی شبہہ نہیں لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ پروفیسر ظہیر احمد صدیقی نے بھی خاص لگن اور محنت کے ساتھ کلیات فانی کو مرتب کیا ہے اس کی وجہ شاید یہ بھی ہو کہ وہ فانی سے یوں بھی وابستگی رکھتے ہیں قبل ازیں اپنی کتاب

''فانی کی شاعری'' شائع کر چکے ہیں۔ پروفیسر ظہیر احمد صدیقی نے کلیات فانی کی تدوین کرتے ہوئے فانی کے ان سارے شعری مجموعوں سے مدد لی ہے جو تا حال شائع ہو چکے ہیں جن میں دیوان فانی، باقیات فانی، عرفانیات فانی، وجدانیات فانی، کلیات فانی اور شرح دیوان فانی وغیرہ شامل ہیں و نیز انہوں نے پروفیسر مغنی تبسم کے ہاں بیاض فانی سے غیر طبوعہ کلام کو اس کلیات میں شامل کیا ہے کلیات کی تدوین میں پروفیسر ظہیر احمد صدیقی نے کئی امور کو ملحوظ رکھا ہے۔ مثلاً فہرست میں اس امر کی نشاندہی کر دی گئی ہے کہ یہ غزل قدیم ہے یا جدید۔۔۔ قدیم سے مراد ۱۹۱۰ سے قبل کا کلام ہے اور جدید سے مراد ۱۹۱۷ کے بعد کا کہا جاتا ہے کہ فانی نے اس کے بعد شعر گوئی ترک کر دی تھی۔ علاوہ ازیں فہرست میں اس امر کی بھی صراحت کر دی گئی ہے کہ کونسی غزل فانی کے کس شعری مجموعہ سے لی گئی ہے۔ جہاں تک معلومات فراہم ہو سکیں غزل کے کہنے کا سنہ بھی دے دیا گیا ہے۔ پروفیسر صدیقی نے مقدمہ میں اگر چہ زیادہ تفصیل سے کام نہیں لیا لیکن فانی کی سیرت اور شاعری کے اہم گوشوں پر اچھی گفتگو کی ہے۔ خصوصاً فانی کی خودداری، انا، ان کے صوفیانہ افکار اور ان کی شاعری کے محور غم اور عشق پر اختصار کے ساتھ لیکن جامع انداز میں لکھا گیا ہے۔ ضمیمہ اول میں فانی کی فارسی غزلیات شامل ہیں اور ضمیمہ دوم میں تراکیب فانی کو شامل کیا گیا ہے نہ صرف تراکیب بلکہ وہ مصرعے بھی جن میں یہ تراکیب استعمال کی گئی ہیں۔ دراصل پروفیسر صدیقی کی کتاب ''فانی کی شاعری'' کا ضمیمہ ہے جس کو یہاں بھی شامل کر دیا گیا ہے لیکن یہاں اس کی افادیت زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ غرض ''کلیات فانی'' ایک اہم کتاب ہے جس کے لئے پروفیسر ظہیر احمد صدیقی اور ترقی اردو بیورو دونوں ستائش کے لائق ہیں۔

☆☆☆

سعادت علی صدیقی
قومی آواز، دہلی۔

کتابوں کی باتیں

فانی کی شاعری

''فانی کی شاعری'' اپنے نوع کی منفرد تصنیف ہے جو ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی صاحب کے فکر قلم کا ایک دلکش شاہکار ہے۔ فانی کو اردو غزل گوئی میں جو مقام حاصل ہے، وہ ارباب کمال سے پوشیدہ نہیں۔ فانی کی شاعری میں زندگی بھی ہے اور زندگی کی اہم حقیقتیں بھی۔ وہ بیسویں صدی کے ایک باکمال شاعر تھے ان کی شاعری کا رشتہ میرؔ اور دردؔ سے جوڑا جا سکتا ہے، فانی عشق و حسن کے شاعر تھے لیکن ان کی دنیا تصوف کی دنیا ہے۔ تصوف کی دنیا میں غم والم رندی و سرمستی، بے باکی حقیقت پرستی، جوش سنجیدگی ہوش بے ہنری کو شعوری طور پر ایک مثبت مقام حاصل ہے۔ اسی لئے فانی کا تغزل صرف تغزل ہی نہیں ہے بلکہ وہ تغزل کی دنیا سے نکل کر عشق الٰہی کی دنیا میں پہنچ گئے تھے۔ فانی حسرتؔ اصغرؔ اور جگرؔ کے دور کے شاعر تھے۔ حسرت کی دنیا غم عشق کی دنیا اور اصغر کی دنیا تصوف کی دنیا رہی اور جگر خواب و خیال کی دنیا سے نکل کر ایسی منزل کیطرف نکل گئے جو خودی کی منزل ہے۔ فانی نے ان سب سے الگ راہ بنائی۔ ان کی شاعری پر پوری بصیرت کے ساتھ غور و فکر اور ان کی شخصیت کو پوری طرح اجاگر کرنے کی ضرورت تھی۔ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی صاحب نے فانی کی شخصیت کے ساتھ ساتھ فانی کے فلسفہ غم (اس کی ماہیت اور اہمیت)، فانی کا غم عشق فانی کا تصوف، میرؔ غالبؔ اور فانیؔ ''فانی اور ان کے معترضین'' اور اردو غزل میں فانی کا

مقام عنوانات کے تحت پوری بصیرت کے ساتھ بحث کی ہے اور آخر میں فانی کی غزلیات کا ایسا انتخاب پیش کیا ہے جس سے فانی کی شخصیت ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔ یوں تو کتاب کا ہر باب دعوت غور وفکر دیتا ہے۔ لیکن جدید اصول انتقاد کے پیش نظر ''فلسفہ غم اس کی ماہیت اور اہمیت'' ''فانی کا غم عشق'' اور ''فانی کا تصوف'' پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور غالباً فانی پر یہ پہلی تصنیف ہے جو اس قدر شرح کے ساتھ ان اہم موضوعات پر بحث کرتی ہے جن کے بغیر فانی کے ساتھ انصاف نہیں کیا جا سکتا۔ اس کتاب میں دو ضمیمے شامل ہیں ضمیمہ اوّل فاضل مصنف کی جدت پسندی کا مظہر ہے جس کے مطالعہ سے فانی کی زبان پر غیر معمولی قدرت، جدید فارسی تراکیب کے برمحل استعمال پر روشنی پڑتی ہے اور یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ فانی نے کس ترکیب یا کس لفظ کو کس انداز میں استعمال کیا ہے۔ ضمیمہ دوم کتابیات پر مشتمل ہے جو فانی کے مطالعہ میں مددگار ثابت ہو سکتی ہیں۔ اور جن سے ''فانی کی شاعری'' میں استفادہ کیا گیا ہے۔ فانی کی شاعری۔ نسیم بک ڈپو لکھنؤ نے شائع کی ہے۔

☆☆☆

چند تاریخی وتوصیفی قطعات

مغیث الدین فریدی

ظہیر صاحب نے خواجہ احمد فاروقی کی غیر موجودگی میں کئی بار صدر شعبہ کے فرائض انجام دئے، مگر بعد میں جب صدر شعبہ کا عہدہ باری باری سینئر اساتذہ کو ملنے لگا اور ظہیر صاحب باقاعدہ صدر شعبہ بنے تو مغیث الدین فریدی صاحب نے یہ تاریخ کہی:

سلطنت دست بدست آتی رہی ہے جیسے — رقص میں جامِ صدارت ہے مسرت ساماں

گردش رنگ طرب کا یہ کرشمہ دیکھو — ہو کے بے بس یہ کہا صدر کی کرسی نے یہاں

''پھر وہی ہم ہیں وہی حضرت صدیقی ہیں''

۱۹۸۶ء

ظہیر صاحب کے پروفیسر بننے پر مغیث الدین فریدی صاحب نے جو تاریخ کہی وہ تاریخ بھی ہے اور دعا بھی:

پروفیسر ظہیر صدیقی — دیکھو دلکش بہار کا عالم

اور ہی آن بان رکھتا ہے — علم کے اعتبار کا عالم

روز افزوں ہو یا خدا یونہی — آپکے اقتدار کا عالم

بن کے تاریخ چھا گیا سب پر — ''اثر افتخار'' کا عالم

۱۹۸۳ء

مومن پر ظہیر صاحب کی کتاب شایع ہوئی اور اس پر انہیں اردو اکیڈمی کا انعام ملا۔ مغیث الدین فریدی صاحب نے اسکی تاریخ لکھی جو تاریخ بھی ہے اور دعا بھی:

طبع کتاب و عطائے انعام

ظہیر تم کو مبارک ہو طرّۂ دستار — ملی ہے فضل خدا سے یہ علم کی مسند
سجی ہے بر میں قبائے کمال و علم و ہنر — ہے فیض تربیت حضرت ضیاء احمدؒ
ہوئے مطالب 'مومن' بھی شامل تاریخ — اگر پدر نہ تو اندپسر تمام کند

۲۱۸ — ۱۷۵۵

۲۱۸+۱۷۵۵=۱۹۷۳ء

جناب خاور

تصنیف یاقوت رنگ

دوستو ڈاکٹر ظہیر ہیں یہ — دولت علم سے امیر ہیں یہ
ڈاکٹر افتخار ہیں بیگم — ایک دوجے کے دستگیر ہیں یہ
نکلی خاورؔ یہ عیسوی تاریخ — ''معدن فرش بے نظیر ہیں یہ''

۱۹۹۶ء

دلکش بدایونی

محترم بھائی حضرت ظہیر صدیقی بدایونی کی نذر

اک گل سرسبد جانِ حسن چمن آپ پر ناز کرتی ہے ہر انجمن
تذکرے جن کے ہر ایک گلشن میں ہیں ایسے پھولوں سے مہکا ہے میرا وطن

طیب علی کاظمی

ادائے کج کلاہی بھی اُنھیں کو زیب دیتی ہے
نمایاں بانکپن ہے جنکی تحریر نظر کش میں
چمن میں تاج کے دیدہ وروں نے کی پذیرائی
ظہیر احمد نے جو اعزاز پایا بزم میکش میں

منظور احمد انصاری بدایونی

ظہیر احمدؔ کی ذات عالی سے بزم اردو کی زیب و زینت ہے
یا اِلٰہی دے ان کو عمر دراز ان کی ہستی بہت غنیمت ہے

نظمی سکندرآبادی

الوداعیہ

دور جا کر اور بڑھ جائے گی چاہت آپکی
کیسے بھولے گا کوئی دلّی سے ہجرت آپکی

اک طرف ہے نسبت ارض بدایوں پر کشش
دوسری جانب فقیرانہ طبعیت آپکی

نام یونیورسٹی دلّی کا پہنچا دور تک
شعبۂ اردو کو راس آئی قیادت آپکی

فیض تقریروں سے پہنچا طالبان علم کو
اور تحریروں سے کی تسلیم عظمت آپکی

آپ نے دلوا دیا مومن کو مومن کا مقام
لائق تحسین ہے مومن پہ محنت آپکی

مدّتوں میں آپ سا انسان آئے گا نظر
دیر تک محسوس ہوگی ہم کو فرقت آپکی

ہے دعا لب پر کہ خوشیاں ہوں میسر آپکو
قادر مطلق کرے ہر جا حفاظت آپکی

آپ جا کر بار بار آئیں دیار میر میں
بار بار آئے نظر نظمی کو صورت آپکی

ظہیر احمد صدیقی دہلی یونیورسٹی شعبہ اردو میں

قطعہ تاریخ رحلت برادر معظم

جناب ظہیر احمد صدیقی

''فکر تاریخ پاک طینت''

(۲۰۰۳ء)

نیک خصلت، نیک خو، طبع سلیم — مطمئن۔ آسودہ۔ سنجیدہ۔ حلیم

محفل اطفال میں تھے خوش مزاج — عاقلوں کی بزم میں دانا فہیم

ان کا شیوہ صلح جوئی اور کرم — ان سے زندہ تھیں روایات قدیم

زیست کی رعنائی سے ''بہلے'' نہ وہ — ''اِنَّ اللہَ عِندَہٗ اَجرٌ عَظِیم''

۴۷ — ۱۴۷۰

[۱۴۲۳ھ = ۴۷-۱۴۷۰]

از سہیل احمد صدیقی

انتخاب غزلیات و منظومات

غـــــزل

جو مل سکا دل خانہ خراب مانگوں گا
میں ان کے لطف سے تھوڑا عتاب مانگوں گا

ابھی تو رحمت یزداں کو خود ہے میری تلاش
دعا کرم کی بروز حساب مانگوں گا

نظام کہنۂ لیل و نہار دیکھ چکا
فلک سے تازہ مہ و آفتاب مانگوں گا

ہوئی نگاہِ عنایت جو میرے ساقی کی
نہ اترے جس کا نشہ وہ شراب مانگوں گا

خدا وہ دن نہ کرے عیش دو جہاں مانگوں
انہی کو ان سے بہ چشم پر آب مانگوں گا

کلیم! لمعہ برق جمال سے پہلے
جو مل سکی نگہ کامیاب مانگوں گا

عوض میں کون و مکاں کے خدا سے صرف ظہیر
میں خاک پائے رسالت مآب مانگوں گا

غـــــزل

منانا چاہتا ہوں جب کبھی روٹھے مقدر کو
نہ جانے کیوں مجھے ہمدم! مشیت روک دیتی ہے

بروئے کار لانا چاہتا ہوں جب ارادوں کو
اچانک مجھ کو یہ برگشتہ قسمت روک دیتی ہے

بنانا چاہتا ہوں جب خرد کو پاسباں دل کا
جنوں آتا ہے آڑے اور وحشت روک دیتی ہے

ہزاروں بار ترک مئے پہ آمادہ ہوا لیکن
مجھے ہر بار ساقی کی مروت روک دیتی ہے

ظہیر ارض مقدس کب سے میری راہ تکتی ہے
مگر یاد وطن مجھ کو بہ منت روک دیتی ہے

غـــــزل

نہ موت ہی کا بھروسہ نہ اعتبار حیات
بتاؤ کس کو ملا ہے جہاں میں اذن ثبات

ہم اپنے سوز دروں کا نہ کر سکے درماں
اگرچہ پاس سے ہو کر گزر گئی برسات

جبین حسن پہ کتنی ہی آگئیں شکنیں
وفور شوق میں ہم کہہ گئے تھے دل کی بات

نگاہ لطف سے اک بار تم نے دیکھا تھا
ہے دل میں اب بھی بپا ایک محشر جذبات

ہمارا غنچۂ دل ہی نہ کھل سکا ورنہ
کلی کو چند نفس ہی سہی ملی تو حیات

ہزار گردش صہبا سہی ظہیر مگر
نہ مل سکے گی مقدر کی گردشوں سے نجات

غـــــزل

دل کا نگر جو تھا افسانوں رومانوں کا شہر
کس کو خبر تھی بن جائے گا ویرانوں کا شہر

افراتفری، چھینا جھپٹی، ظلم، عداوت، بیر
آج تو جنگل سے بدتر ہے انسانوں کا شہر

دیوانے کو پھر آئی ہے آج وطن کی یاد
کاش ذرا پتھر سے نوازے بیگانوں کا شہر

بولو یارو کیسے کٹتی دیر و حرم کی راہ
خیر سے گر رستہ میں نہ پڑتا میخانوں کا شہر

شہر خرد میں روز کے جھگڑے روز نئی ہلچل
اور کبھی اجڑا ہے نہ اجڑے دیوانوں کا شہر

راہ حیات میں دل بے چارہ وہ راہی ہے ظہیر
اپنا وطن بھی جس کے لئے ہو انجانوں کا شہر

غـــزل

میں اکثر سوچتا ہوں زیست کا انجام کیا ہوگا
اسی صورت اگر گزریں گے صبح و شام، کیا ہوگا

نہ جانے پھر علاج تلخیٔ ایام کیا ہوگا
جو چشم مست ساقی بھی رہی ناکام کیا ہوگا

سہارا مل گیا دل کو اگر ان کی نگاہوں کا
بتا اے گردش دوراں ترا انجام کیا ہوگا

جو ہمت ہے تو جینے کے لئے ماحول پیدا کر
خفا جینے سے ہو کر اے دلِ ناکام کیا ہوگا

تری خاطر اٹھے جاتے ہیں میخانہ سے ہم ساقی
ہمارے بعد لیکن بزم کا انجام کیا ہوگا

خطا وار ازل کو دیدیا خلعت نیابت کا
سزا تقصیر کی یہ ہے تو پھر انعام کیا ہوگا

ظہیر اپنے تو روز و شب انہی خدشوں میں کٹتے ہیں
نہ جانے صبح کیا گزرے، نہ جانے شام کیا ہوگا

غـــزل

ہم نے مانا کہ بہاروں کے پیام آئیں گے
کون جانے کہ اسیروں ہی کے نام آئیں گے

جذبۂ ترک وطلب بھی نہ رہے گا باقی
وادیٔ عشق میں ایسے بھی مقام آئیں گے

ایک ہم ہی تری محفل میں نہ ہونگے ساقی
رقص میں یوں تو سدا ساغر و جام آئیں گے

صبح کی دھن میں چلے تھے تو یہ سوچا بھی نہ تھا
اپنے دامن میں لئے ظلمت شام آئیں گے

کم سے کم کانٹوں کو اے بادِ فنا رہنے دے
موسم گل میں یہ دیوانوں کے کام آئیں گے

ہم اٹھائیں گے نہ اب منت دیدار ظہیر
خود ہی جلووں کے نگاہوں کو پیام آئیں گے

غـــزل

مانجھی ہمت ہار نہ دینا کر تو ذرا پتوار بلند
عزم کے آگے طوفان کیا شے کشتی سے کب دھار بلند

میرے گھر میں دھوپ خوشی کی آئے بھلا تو کیسے آئے
میرے گھر کا آنگن چھوٹا، در نیچے، دیوار بلند

روز ازل ابلیس نے کھودی قرب کی منزل خاص مگر
بڑھ تو گئی خود بینی کی عظمت، ہو تو گیا انکار، بلند

فن محدود نہیں ہے یار و رنگوں اور لکیروں تک
دل کے لہو کی آمیزش سے ہوتا ہے فنکار بلند

کلیاں گہری سوچ میں غلطاں شبنم نون کے آنسو روئے
میرے چمن کا حال نہ پوچھو، پھول نگوں سر خار بلند

عشرت فانی تیری خاطر کون بڑھائے دست سوال
ہم کو بہت حساس طبیعت، روشن دل، افکار بلند

ہائے رے قسمت کی محرومی دریا سے بھی پیاسے آئے
اپنا دامن خالی خالی، داتا کی سرکار بلند

کام سے بڑھ کر نام کی قیمت، دل سے زیادہ جیب کی قدر
جیسے اس چوپٹ نگری میں مسجد سے مینار بلند

چاند کی دنیا، اوج ثریا، ہے تو بشر کی زد میں ظہیر
سچ پوچھو تو اپنی نظر میں سب سے فراز دار بلند

غـــزل

پھر کسی انجمن ناز میں جایا جائے
ربط پھر سنگ ملامت سے بڑھایا جائے

اب ضروری ہے کہ گلشن میں نشیمن اپنا
آتش لالہ و گل سے بھی بچایا جائے

حسن بے رنگ کو صد رنگ سمجھنے والو
بت کدہ صحن حرم کو نہ بنایا جائے

آج پھر بزم میں دستور زباں بندی ہے
ڈھونڈھ کر پھر کسی منصور کو لایا جائے

ہائے پابندی آداب کہ افسانہ غم
جس سے کہنا ہے اسی کو نہ سنایا جائے

زندگی شمع سر رہ گزر باد نہیں
آندھیاں اس کو بجھالیں جو بجھایا جائے

ہم وفا کیش تھے کیوں ترک وفا کر بیٹھے
ان سوالات میں اچھا ہے نہ جایا جائے

کیسا دستور ہے دنیا کا کہ اندازۂ غم
لب کے مجبور تبسم سے لگایا جائے

دست بے باک تو مجرم ہیں یہ تسلیم مجھے
اور دامن کو اگر خود نہ بچایا جائے

منزل دوست اسی راہ سے پڑتی ہے قریب
آؤ راہِ، رسن و دار سے جایا جائے

آج کے اہل جنوں سے کوئی کہہ دیتا ظہیر
شہر کا زہر بیاباں میں نہ لایا جائے

غـــزل

منتشر ہو جانے والا غم کا شیرازہ نہیں
وقت کے چھینٹوں سے دھل جائے، یہ وہ غازہ نہیں

آج ہر طاقت کے آگے سر جھکا دیتے ہیں ہم
غالباً ذہنوں میں پیمان ازل تازہ نہیں

شدت احساس کا زنداں بھی ہے کتنا عجیب
اس میں دیواریں ہی دیواریں ہیں دروازہ نہیں

اجنبی چہروں کے خدوخال پڑھنے کے لئے
سادگی بھی اک رکاوٹ ہے۔ فقط غازہ نہیں

ڈھونڈھتا ہے آدمی ٹوٹے مکانوں میں پناہ
تم کو دہشت کا کھلے منظر کی اندازہ نہیں

دیکھتے ہیں رشک سے کیوں ہر بلندی کی طرف
کیا ہمیں اپنے قد و قامت کا اندازہ نہیں

زخم دل بھی مندمل ہونے لگے اب تو ظہیر
ایک غنچہ بھی مرے گلشن میں اب تازہ نہیں

نذر نظیر اکبر آبادی

ہزار گوشہ و تہہ دار ہے نظیر کی ذات
یہ مت کہو کہ وہ عام آدمی لگے ہے میاں

وطن کو ناز ہے اس پر کہ شعر میں اس کے
وطن کی چاہ سموئی ہوئی لگے ہے میاں

وہ زندگی کی حقیقت کی اک کہانی ہے
جو دیکھنے میں ہنسی دل لگی لگے ہے میاں

ہے زندگی کی تب و تاب اس کے نغموں میں
قلم کا زور تو جادو گری لگے ہے میاں

کبھی اذاں، کبھی کانھا کی بانسری کی صدا
قدم قدم پہ ہمیں گونجتی لگے ہے میاں

دلوں کو بھاتا ہے اس کا کھلنڈرا پن بھی
اور اس کی چہل بھی حکمت بھری لگے ہے میاں

بجا کہ رندی و سرمستی اس کا شیوہ ہے
مگر وہ واقف اسرار بھی لگے ہے میاں

ہزار طرح کی کمزوریاں سہی اس میں
مگر ہمیں تو وہ پھر بھی ولی لگے ہے میاں

طلب کی راہ میں گم گشتگی بھی اس کی ظہیر
ہمیں تو حاصل منزل رسی لگے ہے میاں

نذر علی گڑھ

یہ کعبۂ علم و دانش ہے یہ عقل و ہنر کا مخزن ہے
تا حشر خزاں آئے نہ جہاں یہ گلشن ایسا گلشن ہے

یاں بادۂ عقل کے ساغر بھی اور عشق کے رنگیں جام بھی ہیں
عرفان کے اس میخانہ میں روحی بھی ہیں خیام بھی ہیں

اس علم کدہ میں جینے کے آداب سکھائے جاتے ہیں
انسانیت والفت کے سبق انساں کو پڑھائے جاتے ہیں

گمراہیاں فطرت انساں کی اس محفل میں کھو جاتی ہیں
اخلاق کی اقدار اعلیٰ کردار میں ضم ہو جاتی ہیں

اس شمع سے اہل محفل کو ہستی کے شرارے ملتے ہیں
طوفان بلا میں الجھے ہوئے ناخبھی کو کنارے ملتے ہیں

اس بزم میں حق و صداقت کا پیغام سنایا جاتا ہے
اخلاق سنوارا جاتا ہے کردار بنایا جاتا ہے

ہر ذرہ میں جاری و ساری ہے سید کا فیض روحانی
تکمیل یہاں پا جاتی ہے ناپختہ سرشتِ انسانی

اس ارض، پاک پہ شام و سحر انوار کی بارش ہوتی ہے
مٹی بھی یہاں کی سونا ہے کنکر بھی یہاں کا موتی ہے

لافانی عظمت و شوکت کے عنوان بنائے جاتے ہیں
اس علم کدہ میں اے ساقی انسان بنائے جاتے ہیں

یاں عقل و جنوں کی آمیزش انساں کا سہارا بنتی ہے
طوفانِ حوادثِ ہستی کی موجوں میں کنارا بنتی ہے

یاں درس عمل بھی ملتا ہے اور ذوق نظر بھی ملتا ہے
عرفان خودی بھی ہوتا ہے اور سوز جگر بھی ملتا ہے

اللہ کرے یہ بزم حسیں تا حشر یونہی آباد رہے
ہر آفت سے محفوظ رہے ہر خدشہ سے آزاد رہے

☆☆☆

مرثیہ مرزا محمود بیگ ۔ پرنسپل دلّی کالج

اے ہمیں ہر گام پر یاد آنے والے الوداع
ہم کو گریاں چھوڑ کر اے جانے والے الوداع

تجھ سے زندہ تھے زمانہ میں شرافت کے چلن
تھی تری ذات گرامی انجمن در انجمن

لطف، تیرا عام، تیرا فیض لا محدود تھا
نام کی صورت ترا کردار بھی محمود تھا

فطرت عالی کے جوہر تیرے آئینہ میں تھے
بردباری اور تحمل جاگزیں سینے میں تھے

اپنے ہم عصروں میں مثل ماہ تو تابندہ تھا
سچ تو یہ ہے تجھ سے دلّی کا تمدن زندہ تھا

موت تیری اس بھری بستی کو سونا کر گئی
ایسا لگتا ہے ترے مرنے سے دلّی مر گئی

منفرد حسن بیاں میں تھا دم گفتار تو
تھا زبان میر و مرزا کا امانت دار تو

قوم کی واماندگی کا درد تیرے دل میں تھا
شعلہ جاں سوز کیسا تیرے آب وگل میں تھا

دلّی کالج آج زندہ ہے ترے احسان سے
یہ سفینہ چھین کر لایا تھا تو طوفان سے

جانے والے دیدنی ہے بخت کا یہ اہتمام
تو ادھر رخصت ہوا۔ بدلا ادھر کالج کا نام

سونے سونے بام و در ہیں اور فضا سنسان ہے
تو نہیں تو دلّی کالج قالب بے جان ہے

آنکھ سب کی شبنمی محسوس ہوتی ہے ہمیں
ہر طرف تیری کمی محسوس ہوتی ہے ہمیں

تو نہیں تو آج ساری انجمن بے نور ہے
صرف کالج ہی نہیں سارا وطن بے نور ہے

جانے والے جا تجھے بخشش کا سرمایہ ملے
رحمت باری ملے، فردوس کا سایہ ملے

☆☆☆

اساتذہ میں مرکزی حیثیت حضرت قبلہ والد مرحوم کی تھی۔ جن کے قدموں میں بیٹھ کر میرے ادبی ذوق کی تسکین ہوئی۔

میرے دادا اعلیٰ پایہ کے شاعر اور صاحب علم انسان تھے۔ ان کا انتقال اسوقت ہی ہو چکا تھا جب میں بہت چھوٹا تھا۔ انکی تالیف ''تصحیح اللغات'' زبان کے سلسلہ میں سند کہی جا سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان سے استفادہ کا تو سوال نہیں تھا البتہ والد مرحوم کے قدموں میں بیٹھ کر کچھ سیکھنے کی سعادت حاصل رہی۔ اپنے سب بھائیوں میں یہ فخر مجھے سب سے زیادہ نصیب رہا۔

اس ماحول اور خاندانی اثرات کا نتیجہ تھا کہ میں نے اپنے اسکول کے زمانے سے مضمون لکھنا شروع کر دیا تھا۔ اسکول کے زمانے میں جبکہ نویں کلاس میں پڑھ رہا تھا تو اسکول میگزین میں مضمون لکھا ''فانی کے کلام میں درد کیوں ہے'' اس مضمون پر میرے استاد سید محمد ٹونکی صاحب نے بڑی محبت سے میری تعریف کی اور اسکول کا بہترین مضمون نگار کا انعام دلوایا اس کے ساتھ اسکول میگزین کے بورڈ میں مجھے بھی شامل کر لیا۔ وہ کونسا مبارک دن تھا کس مقدس شخصیت نے ہمت افزائی کی تھی کہ اس کے بعد یہ شوق برابر بڑھتا گیا۔ میں مضمون لکھتا والد صاحب قبلہ سے اصلاح لیتا۔ قبلہ کے اصلاح دینے کا عجیب انداز تھا وہ صرف ایک آدھ لفظ بدل دیتے یا کوئی جملہ بدل دیتے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ پیراگراف حذف کر کے خود لکھ دیا ہو۔ البتہ جن باتوں کی کمی کا احساس ہوتا ان کی نشاندہی ضرور فرما دیتے۔ اسکول میگزین کے علاوہ میری ہمت افزائی علی گڑھ کے ایک ہفتہ وار اخبار ''جمہور'' نے کی جو بالائے قلعہ سے شاہد خاں شیروانی صاحب نکالتے تھے۔ ایم۔ اے۔ تک یہ اخبار ہمارا ساتھ دیتا رہا۔ یہ لطیفہ بھی یاد ہے کہ فانی پر ایک مضمون لکھا اور جوش میں آکر رسالہ 'آج کل' کو بھیج دیا جوش ملسیانی اس کے مدیر تھے۔ ہمارا مضمون شکریہ کے ساتھ واپس آ گیا۔ بڑی مایوسی ہوئی۔ اس کا تذکرہ میں نے خلیل الرحمٰن اعظمی مرحوم سے کیا۔ انہوں نے کہا کہ آپ کا مضمون اچھا ہے شاید آپ سے ناواقف ہونے کی

مکان نامہ

ہر طرح کی مادّی آسائشوں کے باوجود۔ کون رہ سکتا ہے دلّی میں قلندر کے سوا
مال و دولت، عزت و نام آوری، جاہ و جلال الغرض ہر چیز ملتی ہے یہاں گھر کے سوا
سر پہ کہنے کو ہے سایہ چاندی والوں کا مگر گھر ملا بھی ہے ہمیں تو میر کے گھر کی طرح
جھاڑیاں پھیلی ہیں سبزہ اگ رہا ہے ہر طرف غالبؔ مرحوم کے دیوار اور در کی طرح
اس پہ طرہ گھر کے مالک کا یہ حکم نادری سال بھر کا جنوری میں صاف ہو جائے حساب
حد تو یہ ہے چھینک لینے پر بھی ہیں پابندیاں سچ تو یہ ہے بن گئی ہے زندگانی اک عذاب
دو بجے شب کو فلش کیوں کام میں لایا گیا کا ریڈر کا بلب کیوں جلتا رہا ہے ساری رات
جون میں گرمی کہاں ہوتی ہے کولر کیوں چلا ان سوالوں سے ہمیں پل بھر نہیں ملتی نجات
خندہ پیشانی سے اس کی میز بانی تو الگ گھر کوئی مہمان آجائے تو ڈر جاتے ہیں ہم
ان کے گھر مرغے اڑاؤ خود انہیں دعوت نہ دو دوستوں کا سامنا کرنے سے گھبراتے ہیں ہم
دن پھرا کرتے ہیں گھورے کے بھی بارہ سال میں بس ہمارا غنچۂ دل ہے کہ کھلتا ہی نہیں

ہم تو پگڑی کیا ہے خلعت بھی خوشی سے دیں مگر اپنے ڈھب کا کوئی گھر دلّی میں ملتا ہی نہیں

ہے یہ عالم گھر تو کیا گھر کا تصور بھی ہے جرم ہائے یہ مجبوریاں، محرومیاں، ناکامیاں

پوری کالونی ہے جنت میں ہمارے نام کی اور دلّی میں کرایہ پر نہیں ملتا مکاں

اس جنم میں تو تمنائیں بر آنے کی نہیں کیا کریں اہل تمنا صبر کوشی کے سوا

آج سے نکلا کریں گے سر پہ لے کے تام جھام اب کوئی چارہ نہیں خانہ بدوشی کے سوا

یہ بھی کوئی زندگی ہے سوچتے رہتے ہیں ہم گھر کی طالب گھر کی خواہاں، گھر کی ماری زندگی

صدر شعبہ اور بے گھر ہو یہ کیسا ظلم ہے ہر پروفیسر کی ذلت ہے ہماری زندگی

دوستوں کو جب سناتے ہیں پریشانی کا حال وہ یہ کہتے ہیں کہ غم کس بات کا گر گھر نہیں

شہر میں غالب کے تم آفات سے محفوظ ہو یہ کوئی کم ہے کہ سیلاب بلا کا ڈر نہیں

جھگیوں کے رہنے والے بھی پریشاں ہیں مگر سر چھپانے کے لئے اک گھر تو ملتا ہے انہیں

کیسا کیسا چوکیداروں پر ہمیں آتا ہے رشک کم سہی تنخواہ پر چھپّر تو ملتا ہے انہیں

قبلہ وائس چانسلر صاحب سے یہ کیسے کہیں صدر شعبہ ہیں مگر اپنا کوئی گھر ہے نہ گھاٹ

آپ پورے تین سو بھی کاٹ لیں تنخواہ سے کیمپس میں ہم کو اک چھوٹا سا گھر کر دیں الاٹ

آج مادی پور بھاگے جائے کل شاہدرے ختم آخر یہ تلاش خانہ کا چکر تو ہو

کاش گھر والوں میں ہو جائے ہمارا بھی شمار بے در و دیوار ہی کا ہو مگر اک گھر تو ہو

☆☆☆

کوائف۔ مراتب ومناصب

(الف)

نام	-	ظہیر احمد صدیقی
والد کا نام	-	پروفیسر ضیاء احمدؒ بدایونی
والدہ	-	شکیلہ خاتون
دادا کا نام	-	مولوی رفیع احمدؒ
تاریخ پیدائش	-	۱۰ جولائی ۱۹۲۹ء
وطن	-	بدایوں۔ یو۔ پی۔
وفات	-	سترہ فروری 2003ء تدفین علیگڑھ۔
خاندان	-	دو بیٹیاں اور دو بیٹے یادگار چھوڑے ہیں

(ب) ۱۔ تعلیمی لیاقت

ام۔اے۔اردو Ist	علیگڑھ مسلم یونیورسٹی	۱۹۵۳ء
ام۔اے۔فارسی Ist	" " "	۱۹۵۹ء
پی۔ایچ۔ڈی۔	دہلی یونیورسٹی	۱۹۶۲ء

(ب) ۲۔ ملازمت

لکچرر۔ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ ۔	۱۹۵۴ء
لکچرر۔ سینٹ اسٹیفنس کالج دہلی۔	۱۹۵۵ء
لکچرر۔ دہلی کالج۔	۱۹۵۵ء تا ۱۹۶۱ء
ریڈر شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی۔	۱۹۶۱ء
پروفیسر شعبہ اردو۔ دہلی یونیورسٹی	۱۹۸۲ء
ریٹائرمنٹ۔	۱۹۹۵ء

(ج) مختلف علمی انجمنوں کی رکنیت

۱۔ ایڈیٹر علی گڑھ میگزین۔ طنز وظرافت نمبر

۲۔ ایڈیٹر ونگراں دہلی کالج میگزین۔ دہلی کا دبستان شاعری نمبر

۳۔ انوواد (ہندی) ایڈیٹوریل بورڈ کے ممبر

۴۔ ''اردوئے معلّٰی'' (دہلی یونیورسٹی کی ریسرچ میگزین) کے ایڈیٹوریل بورڈ کے ممبر

۵۔ جامعہ اردو (علیگڑھ) کی مجلس عام کے ممبر ادبی کمیٹی اور ایگزیکٹو کمیٹی کے ممبر

۶۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کی ایگزیکٹو کمیٹی اور مجلس عام کے ممبر

۷۔ علی گڑھ یونیورسٹی کورٹ کے ممبر (دوبار)

۸۔ ٹیگور اکیڈمی (دہلی) کی ایگزیکٹو کمیٹی کے ممبر

۹۔ غالب اکیڈمی (دہلی) کی ایگزیکٹو کے ممبر

۱۰۔ غالب انسٹی ٹیوٹ (دہلی) کی اشاعتی کمیٹی کے ممبر

۱۱۔ کل ہند اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن کے جوائنٹ سکریٹری وخزانچی

۱۲۔ محمد علی جوہر صدی تقریبات کے جنرل سکریٹری

۱۳۔ نائب صدر انجمن ترقی اردو

۱۴۔ ممبر اقلیتی کمیشن (دہلی شاخ)

۱۵۔ پرووائس چانسلر جامع اردو (علی گڑھ)

(د) انعامات

۱۔ دہلی اردو اکیڈمی ایوارڈ

۲۔ نیاز فتح پوری ایوارڈ۔ کراچی

۳۔ میر اکیڈمی ایوارڈ۔ لکھنو

۴۔ بزم انجم ایوارڈ۔ بدایوں

۵۔ میکش اکبر آبادی ایوارڈ۔ آگرہ

۶۔ اتر پردیش اکیڈمی ایوارڈ۔ لکھنو

(ہ) فہرست مطبوعات

نصابی ایڈیشن

۱۔ مثنوی سحر البیان۔ ایک تنقیدی مطالعہ ۱۹۵۴ء

۲۔ مثنوی گلزار نسیم کا تنقیدی مطالعہ ۱۹۵۵ء

۳۔ مجموعہ نظم حالی۔ و تحقیقی مطالعہ حالی ۱۹۵۶

۴۔ انتخاب دیوان مومن معہ تنقیدی نوٹ ۱۹۵۸

۵۔ قصائد مومن معہ مقدمہ ۱۹۶۰

۶۔ دیوان درد کا تنقیدی مطالعہ ۱۹۶۸-۱۹۶۳-۱۹۵۶ء

۷۔ جذبات رضی ۱۹۵۶

۸۔ نقش ہائے رنگ رنگ۔ غالب کی فارسی غزلیات و مثنویات مع ترجمہ۔ ۱۹۷۰

۹۔ تحقیقی مطالعہ انیس ۱۹۶۵ء

۱۰۔ انشائے مومن۔ مومن کے منتخب فارسی خطوط ۱۹۷۷ء

۱۱۔ نقیب بہار۔ دیوان حبیب احمد صدیقی معہ مقدمہ ۱۹۹۰ء

۱۲۔ کلیات ضیاء۔ دیوان پروفیسر ضیاء احمدؒ بدایونی۔ ۱۹۹۶ء

۱۳۔ ارمغان فاروقی۔ خواجہ احمد فاروقی صاحب پر ریسرچ پیپرس ۱۹۸۷ء

دوسری اہم ادبی مطبوعات

۱۔ مومن۔ شخصیت اور فن ۱۹۷۲ء

۲۔ خواجہ میر درد ۱۹۸۳ء

۳۔ فانی کی شاعری ۱۹۶۹ء

۴۔ فکری زاویے۔ تنقیدی مضامین کا مجموعہ ۱۹۷۱ء

۵۔ اردو ادب میں جمالیاتی اقدار ۱۹۷۹ء

۶۔ احساس و ادراک ۱۹۸۱ء

۷۔ میزان قدر ۱۹۹۳ء

۸۔ جدید شاعری۔ ۱۹۹۳ء

۹۔ بچوں کے لئے مطبوعات

۱۔ بچوں کے درد ۲۔ بچوں کے فانی

وجہ سے مضمون واپس آ گیا ہے۔ خلیل صاحب نے مضمون ''فانی کا فلسفہ غم و عشق'' مجھ سے لیا اور خود آ جکل کو بھجوایا اور عرش صاحب کو لکھ دیا کہ ظہیر صاحب میری فرمائش پر یہ مضمون آپ کو بھجوا رہے ہیں۔ اس دن بڑی خوشی ہوئی جب رسالہ میں مضمون شائع ہوا اور غالباً چالیس روپیہ کا منی آرڈر معاوضہ مضمون موصول ہوا۔ یہ پہلا معاوضہ تھا جو مضمون کے سلسلہ میں ملا تھا۔ مضمون کے سلسلہ میں یہ واقعہ بھی یاد آ رہا ہے کہ میں نے اپنا ایک مضمون میاں بشیر الدین صاحب مدیر ہمایوں لاہور کو بھیجا۔ مضمون تھا ''فلسفہ غم کی ماہیت اور اس کی اہمیت'' روانہ کرنے کے بعد انتظار کرنے لگے کہ کب معذرت کے ساتھ مضمون واپس آتا ہے۔ ایک روز میاں بشیر الدین صاحب کا خط آیا کہ آپ کا مضمون بیحد پسند آیا اور اس کو میں نے ہمایوں کے سالنامہ کے لئے رکھ لیا ہے۔

میری ملازمت کی کہانی بھی دلچسپ ہے۔ ۱۹۵۳ء میں جب میں نے اردو میں ایم۔ اے۔ کیا تو فطری طور پر ملازمت کی جستجو ہوئی رشید احمد صدیقی کی مہربانی سے شعبہ میں عارضی طور پر لیکچرر بھی ہو گیا۔ اس زمانے میں ایک مستقل لیکچرر کی جگہ کا اشتہار ہوا۔ مجھ کو یہ اعتماد کہ میں فرسٹ کلاس ایم۔ اے۔ ہوں۔ عارضی طور پر کام کر رہا ہوں اور سب سے بڑی بات یہ کہ میرے خاندان کی خدمات اس درس گاہ سے وابستہ ہیں اور شاید ان باتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے وائس چانسلر ذاکر صاحب صدر، شعبہ اردو شید احمد صدیقی صاحب اور ایکسپرٹ آل احمد سرور صاحب نے بھی لوگوں سے کہہ دیا تھا کہ اس جگہ پر خلیل الرحمان اعظمی یا ظہیر احمد صدیقی کا تقرر ہو گا۔ انٹرویو ہوا اور اس میں نہ میرا تقرر ہوا اور نہ خلیل الرحمان مرحوم کا بلکہ سرور صاحب لکھنو سے ڈاکٹر محمد حسن صاحب کو لے کر آئے تھے اور اپنے اثر سے ان دونوں حضرات (وائس چانسلر اور صدر شعبہ) کو اپنا ہمنوا بنا لیا۔ یہ میرے لئے زندگی کا پہلا سانحہ تھا اور میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ کیا اتنے بڑے لوگ بھی کسی سیاست کا شکار ہو سکتے ہیں۔ انٹرویو کے دوران یہ قصہ بھی قابل ذکر ہے کہ ہم غالب اقبال وغیرہ کو یاد کر کے پہنچے تھے تاریخ ادب کے ادوار کو بار بار دہرا رہے

تھے مگر جب سلیکشن کمیٹی کے سامنے پہنچے تو ذاکر صاحب نے اچانک سوال کر دیا کہ ایک اچھے استاد کی پہچان کیا ہے آپ یقین جانئے کہ پسینہ آ گیا اور ذہن سے غالب اقبال وغیرہ سب رخصت ہو گئے۔ چند لمحات تک تو نروس رہا پھر ذہن نے رہنمائی کی کہ ذاکر صاحب غیر متعلق سوال کر دیتے ہیں تو کیوں نہ غیر متعلق جواب دیا جائے۔ میں نے عرض کیا کہ استاد کو ایمان دار ہونا چاہئے۔ کہنے لگے کہ استاد ایماندار ہے مگر پڑھانا نہیں آتا۔ میں نے کہا کہ ''اگر ایماندار ہے تو استعفا دیدے گا''۔ اب سوچتا ہوں کہ جواب غیر متعلق نہیں تھا کچھ من جانب اللہ رہنمائی ہو رہی تھی۔ بعد کو اس جواب کی رشید صاحب سے داد ملی اور سب ذہنی تکدر دور ہو گیا۔ اپنے تقرر نہ ہونے پر کافی دن تک ذہنی طور پر الجھا رہا اس الجھن میں ایک روز ذاکر صاحب کے پاس پہنچ گیا۔ میرے افسردہ لہجہ میں تلخی تھی۔ میں نے کہا کہ اب تک خیال تھا کہ اردو والے کے لئے ہندوستان میں جائے پناہ علی گڑھ ہے مگر اب علم ہوا کہ میرے سوچنے کا انداز غلط تھا۔ اب نوجوان پاکستان نہ جائیں تو کیا کریں۔ ذاکر صاحب کا چہرہ سرخ ہو گیا اور برہمی سے بولے۔ جی ہاں آپ بھی پاکستان چلے جایئے اور جو کر سکتے ہیں وہ کیجئے۔ میں نے عرض کیا کہ میں کیا کر سکتا ہوں البتہ یہ ضرور یاد رہے گا کہ میرے وائس چانسلر نے مجھ سے یہ کہا ہے۔ ذاکر صاحب کا لہجہ نرم ہو گیا اور جب میں افسردگی کے ساتھ اٹھ کر جانے لگا تو کمرہ کے باہر تک ساتھ آئے اور میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگے ''میرے عزیز زندگی کی چھوٹی چھوٹی ناکامیوں سے اس طرح متاثر ہو گئے تو بڑی ناکامیابی کیسے برداشت کرو گے''۔ اس جملے نے واقعی مجھے حوصلہ دیا۔ جب باہر آیا تو میں نے اللہ سے توبہ کی کہ میں نے تیرا سہارا لینے کی بجائے کمزور سہاروں کو اپنانے کی کوشش کی۔ شاید خدا کو بندہ کا یہ عجز پسند آ گیا اور اچانک ایک روز دہلی کالج کے پرنسپل مرزا محمود بیگ صاحب علی گڑھ تشریف لائے اور پروفیسر عمر الدین صاحب (صدر شعبہ فلسفہ) سے کہا کہ ہم کو سینٹ اسٹیفنس کالج کے لئے ایک لیکچرر کی ضرورت ہے۔ عمر الدین صاحب نے اس زیادتی

کی داستان سنائی جو میرے ساتھ ہوئی تھی۔ بیگ صاحب نے مجھے بلوایا اور دریافت کیا کہ میں دہلی میں ملازمت کرنا پسند کروں گا۔ علی گڑھ کو چھوڑنے کا تصور میرے لئے روح فرسا تھا مگر ذہن اس قدر ماؤف تھا کہ میں نے فوراً اپنی رضامندی دیدی۔ انھوں نے فرمایا کہ آپ میرے ساتھ کار سے چلئے اور کل جوائن کر لیجئے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ملازمت اس طرح خود چل کر میرے پاس آئے گی۔ بے ساختہ زبان سے نکلا کہ واقعی سب سے مضبوط سہارا صرف اللہ کا ہوتا ہے۔ دہلی آئے اور سینٹ اسٹیفنس کالج کے استاد ہو گئے۔ یہ جگہ عارضی تھی مگر ایک سال کے بعد ہی دہلی کالج میں جگہ ہوئی اور میں مستقل ہو کر دہلی کالج آ گیا۔ ابھی دہلی کالج میں پانچ سال ہوئے تھے کہ دہلی یونیورسٹی میں میرا تقرر ۱۹۶۱ء ریڈر کی حیثیت سے ہو گیا۔ اس کے ساتھ خواجہ احمد فاروقی صاحب کے امیریکہ چلے جانے کی وجہ سے قائم مقام صدر شعبہ مقرر ہوا۔ اس کے بعد قائم مقام اور مستقل شعبہ اردو کی صدارت کا موقع ملا۔ گویا ملازمت چار حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ ۱۹۵۴ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ۱۹۵۵ء میں سینٹ اسٹیفنس کالج ۱۹۵۵ء میں دہلی کالج میں تقرر ہو گیا۔ اور اس کالج سے وابستہ ہوا جو حالی، نذیر احمدؒ، اور آزاد وغیرہ کی روایات کا امین سمجھا جاتا تھا۔ اور ۱۹۶۱ء میں دہلی یونیورسٹی پہنچا۔

میری شادی میری پھوپی کی لڑکی افتخار بیگم سے ۱۹۵۴ء میں ہوئی۔ اس وقت وہ بی۔ اے۔ میں پڑھ رہی تھیں۔ علی گڑھ سے بی اے کرنے کے بعد دہلی سے فرسٹ ڈویزن میں ایم اے کیا اور اس کے بعد جب وہ علی گڑھ میں لیکچرر تھیں اس زمانے میں شاکر ناجی کی کلیات کی تدوین پر ان کو پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی علیگڑھ سے دہلی آ گئیں اور یہاں ذاکر حسین کالج میں شعبہ اردو میں ریڈر ہو گئیں۔ ہمارے دو لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں۔ لڑکیوں کی اور ایک بیٹے کی شادی ہو چکی ہے اور صاحب اولاد ہیں۔ چھوٹا بیٹا ابھی تعلیم کے مراحل سے گزر رہا ہے۔

میں نے مولوی شفیع احمد محو کا ذکر کیا تھا وہ افتخار بیگم کے دادا اور افضال احمد بسمل

ان کے تایا تھے۔ یہ دونوں امیر مینائی کے شاگرد تھے۔ افتخار بیگم کے بھائی پروفیسر ظفر احمد صدیقی شعبہ فلسفہ کے صدر تھے۔ دوسرے بھائی پروفیسر اختر اقبال کمالی۔ اظہر احمد کمالی اور نیر اقبال کمالی مرحوم یہ سب شعر کہتے تھے اور بہت اچھا کہتے تھے۔ خدا نے حافظہ غیر معمولی دیا ہے۔ اس ماحول کا اور علیگڑھ کی تعلیم کا اثر تھا کہ افتخار کو شعر کہنے کا شوق پیدا ہوا۔ انہوں نے پہلی نظم حج بیت اللہ جاتے وقت اس وقت کہی جب گھر پر دو برس کے بچہ کو چھوڑ کر جا رہی تھیں۔ قیام بیت اللہ کے وقت گھر کی یاد بھول گئیں اور نعت گوئی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ شاعری کے علاوہ ان کو خاکے لکھنے کا بھی شوق ہے۔ اور افسانے بھی لکھتی ہیں۔ لیکن خاندانی روایت کے مطابق انہوں نے بھی گوشۂ گمنامی اور گھر کی چہار دیواری کو زیادہ پسند کیا۔

مجھ کو ادبی ذوق وشوق کچھ تو ورثہ میں ملا اور کچھ ماحول کا احسان ہے، ورنہ میں کیا میرا ادبی سفر کیا۔ خوش قسمتی سے وطن وہ تھا جس کے شعر وادب کا چرچا تاریخ کا حصہ بن چکا ہے۔ خاندان وہ ملا جس کے علم وفضل کی قسم کھائی جا سکتی ہے۔ تعلیم کے لئے وہ سرزمین ملی جس کو مدینۃ العلم (علیگڑھ) کہا جا سکتا ہے۔ اسکول اور یونیورسٹی کے استاد وہ ملے جن کو علم کا کوہ پیکر کہئے۔ ملازمت کے لئے غالب ومومن کی سرزمین ملی اور لطف یہ ہے کہ کالج وہ ملا جس کی ادبی روایت آزاد۔ نذیر احمد۔ مولوی مملوک علی اور صہبائی سے شروع ہوتی ہے۔ میری مراد دلّی کالج سے ہے۔ خدا نے جب اتنی نعمتیں فراہم کر دیں تو شعر وادب سے دلچسپی نہ ہونا کفران نعمت نہ ہوگا تو کیا ہوگا۔ اس پورے سفر میں جو تصنیفات وجود میں آئی ان کی تفصیل میں طوالت کے خیال سے نہیں جا رہا۔ ویسے بائیس کتابیں تصنیف یا تالیف کر چکا ہوں۔

قیام دہلی کے زمانے میں جس شخص نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ خواجہ احمد فاروقی تھے۔ خواجہ صاحب نے دہلی میں اردو کی شمع اس وقت روشن کی جب حوادثات زمانہ اس کو بجھانے پر آمادہ تھے۔ خواجہ صاحب نے زبانوں کے ارتباط پر اس وقت زور

دیا جب ساہتیہ اکیڈمی وجود میں نہیں آئی تھی۔ انھوں نے دہلی یونیورسٹی اور اس کے کالجوں میں اردو تعلیم کا بیڑہ اس وقت اٹھایا جب صرف تین استاد اور ایم اے میں چار طالب علم ہوا کرتے تھے۔ میں اس بات کا گواہ ہوں کہ انھوں نے شعبہ کے فروغ کے لئے کبھی دن کو دن اور رات کو رات نہیں سمجھا۔ جب وہ کام کرتے کرتے تھک جاتے تو یہ ان کے نئے کام کا آغاز ہوتا۔ خواجہ صاحب میرے صرف صدر شعبہ ہی نہیں تھے بلکہ محسن بھی تھے۔ آپ کو شعبہ کے بیشتر اصحاب وہ ملیں گے جو خواجہ صاحب کے ممنون کرم ہیں۔ وہ اس کا اعتراف کریں یا نہ کریں۔ اردو کے احسانات تو بہت سے لوگوں پر ہیں مگر خواجہ صاحب کا احسان اردو پر ہے۔ ان کی اس بے لوث خدمت کا اعتراف بہر نوع کرنا ضروری تھا۔ اس لئے ان کے رٹائر ہونے کے بعد میں نے اپنی صدارت کے زمانے میں تین کاموں کو انجام دینے کا تہیہ کیا۔ ایک یہ کہ خواجہ احمد فاروقی کے نام پر گولڈ میڈل دیا جانے لگے۔ دوسرے وہ پروفیسر ایمریٹس ہو جائیں اور تیسرے ارمغان فاروقی شائع ہو جائے خدا نے مجھے سرخرو کیا اور شعبہ کے احباب کا تعاون تھا کہ یہ سب کام اس خوبی سے ہوئے کہ لوگوں کو تعجب تھا۔ ان کاموں کی تکمیل خواجہ صاحب کی ہر دل عزیزی کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

اکثر لوگ دریافت کرتے ہیں کہ میں نے شاعری کب سے شروع کی۔ اگر میں یہ کہوں کہ میں شاعر نہیں بلکہ نثر نگار ہوں تو آپ کو تعجب نہیں ہونا چاہئے۔ کبھی کچھ ٹوٹے پھوٹے شعر کہہ کر کبھی برادران محترم اظہر احمد کمالی مرحوم کی خدمت میں اور کبھی برادرم محترم میکش بدایونی مرحوم کی خدمت میں پیش کر دیتا۔ ان کی اصلاح ان اشعار کو اس قابل بنا دیتی کہ احباب کی محفل میں پیش کر سکوں یہی سبب ہے کہ شعری سرمایہ اسقدر کم ہے کہ تازہ غزل بھی معلوم نہیں کہ کتنی مرتبہ محفل میں سنا چکا ہوں۔

ہاں البتہ اس سوال کا دوسرا حصہ دلچسپ ہو سکتا ہے کہ میں کن شعرا سے متاثر ہوں۔ میں جب اپنی پسندیدگی کی بات کر رہا ہوں تو کسی شاعر کو کسی دوسرے شاعر پر ترجیح کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ چند شعرا ہیں جن کو ہمیشہ میں نے پسند کیا ہے اور ان کی عظمت کا

انتساب

ظہیر! آپ کہا کرتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کی نبوت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ آپؐ کی بیوی نے بھی آپؐ کو نبی تسلیم کرلیا تھا۔ لیجیے میں بھی اس کتاب کو شایع کرا کے آپ کی خوبیوں کا اعتراف کر رہی ہوں۔

افتخار

قائل رہا ہوں۔ میر۔ غالب۔ اقبال۔ انیس۔ فانی۔ اپنی طالب علمی کے زمانے سے معلوم نہیں کیوں فانی کو ذہنی طور پر قریب پایا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ اسکول کی تعلیم کے زمانے میں کسی نے یہ شعر پڑھا تھا۔

وہاں سجدے سے اب تک قدسیوں کے سر نہیں اٹھے
پڑا تھا جس جگہہ راہ محبت میں قدم میرا

شعر میں معلوم نہیں کون سا جادو تھا کہ آج بھی جب اپنی اس پسند پر نظر ڈالتا ہوں تو کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ مومن خاں سے دلچسپی میری بعد کی دریافت ہے میں نے ہمیشہ محسوس کیا کہ اگر مومن کے زمانے میں ایک پہاڑ (غالب) درمیان میں نہ آجاتا تو اس شاعر کی بلندی کا لوگ شاید زیادہ بہتر اندازہ کر سکتے تھے۔ نثر نگاروں میں شبلی کی تحریروں نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا۔ جو شگفتگی اور جمالیاتی رچاؤ مجھے شبلی کے یہاں نظر آتا ہے وہ کسی دوسرے ادیب کے یہاں نہیں نظر آتا۔

ایک بات جو اپنے بعد آنے والی نسل سے کہنا چاہتا ہوں یہ ہے کہ زندگی میں اس وقت توازن پیدا ہوگا جب ہمارے نوجوان خدا پر بھروسہ اور اپنے پر اعتماد کرنا سیکھیں گے۔ ادب میں سب سے مہلک چیز بے ادبی ہے۔ یہ بے ادبی کبھی پروپیگنڈے سے پیدا ہوتی ہے اور کبھی ذہنی تعصب سے فروغ پاتی ہے۔ اس سے خبردار رہنے کی ضرورت ہے۔ ادب میں صالح روایات اور جمالیاتی اقدار جزو لاینفک ہیں ان کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ اردو سے اس طرح محبت کرو جیسے وہ ایک عبادت ہے۔ اردو ایک زبان ہی نہیں ہے بلکہ ایک تہذیب بھی ہے۔ یہ سلیقہ کی زبان ہے۔ اس سے منسلک سوال اس کے رسم الخط کا ہے۔ وہ لوگ جو اردو رسم الخط بدلنے کی بات کرتے ہیں وہ گویا اردو کو ختم کرنے کی بات کرتے ہیں۔ ایسے لوگ نہ زبان کے وفادار ہو سکتے ہیں اور نہ اپنے ملک کے۔ زبان اور رسم الخط کا رشتہ روح اور جان کا ہے۔ لوگوں کا حافظہ کمزور ہوتا ہے اس لئے ان کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ ملک کی آزادی میں جو رول اردو زبان کا رہا ہے وہ کسی دوسری زبان کا نہیں رہا ہے۔

میرا عقیدہ ہے کہ اگر ملک میں دو کرسیاں مضبوط ہیں تو ملک محفوظ ہے۔ ایک استاد کی اور دوسری عدلیہ کی۔ یہ بات میں نے اپنے ایک دوست کے سامنے کہی جو جج

کے معزز عہدہ پر فائز ہیں تو وہ بہت متاثر ہوئے اور کہنے لگے کہ آپ کی کرسی کا حال تو مجھے معلوم نہیں مگر عدلیہ کی کرسی نہ صرف ہل چکی ہے بلکہ اس کے پائے ٹوٹتے جا رہے ہیں اس پر ہمارے ایک استاد ساتھی نے فرمایا کہ اس کے بارہ میں بھی کسی خوش فہمی میں نہ رہئے یہ کرسی بھی ڈانواڈول ہے۔ بہر حال میرا میدان تعلیم ہے اس کے بارے میں چند تلخ حقائق کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔

ڈائرکٹوریٹ آف اجوکیشن ہو یا U.G.C یا حکومت کے ارباب اختیار۔ تعلیم سے کسی کو دلچسپی نہیں ہے۔ ان کا مقصد تجارت ہے۔ تعلیمی زوال کے مجرم استاد اور طلبہ دونوں ہیں۔ استاد ذاتی منفعت کے لئے شاگردوں کو گمراہ کر رہے ہیں اور شاگرد تن آسانی اور عجلت پسندی میں مبتلا ہیں۔ حد یہ ہے کہ ریسرچ کرانے کے لئے دوکانیں کھل گئی ہیں۔

میں ایک رجائیت پسند انسان ہوں اور تاریکی میں ایک ستارے کی چمک کو بھی روشنی کی دلیل خیال کرتا ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس دور میں شاعری ہی نہیں ہر طرح کا ادب بھی زد میں آ گیا ہے۔ مگر یہ وقت ہر قوم کے ادب پر آتا رہا ہے اس لئے مایوسی کی ضرورت نہیں۔ میرے نزدیک ادب اور زندگی دونوں میں توازن، نظام اقدار، اور جمالیاتی عناصر کا ہونا ضروری ہے۔ کچھ قدریں ابدیت کی حامل ہوتی ہیں جن سے انحراف ممکن بھی نہیں اور سود مند بھی نہیں۔ ان قدروں کا تعلق ماضی سے بھی ہوتا ہے اور جدید دور سے بھی۔ ادب کا زندگی سے بہت گہرا تعلق ہے مگر زندگی کی بے راہ روی کی اس میں گنجائش نہیں۔ دوسرے الفاظ میں ادب میں بے ادبی گناہ ہے۔ ادب کے لئے سب سے سود مند راستہ یہ ہے کہ جدید ذہن ماضی سے اپنا رشتہ منقطع نہ کرے۔ چراغ سے ہمیشہ چراغ جلتے آئے ہیں اور ادب کو تجارت اور سیاست سے آزاد کرا دیا جائے تو بہت سے امراض کا ازالہ ہو سکتا ہے۔

ظہیر احمد صدیقی

جون ۱۹۹۷ء

سید حامد،
سابق وائس چانسلر،
مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ

یادش بخیر

اس زمانہ میں جو ملاوٹ کا دور ہے، جب انسان خودغرضی کا تابع فرمان رہتا ہے، جب لوگ حصولِ زر کو زندگی کا مقصد بنا لیتے ہیں، اور اس کی خاطر قدروں کو قربان کرتے رہتے ہیں؛ جب راست روی پر لوگ ترس کھاتے ہیں جیسے اپاہج پر ترس کھایا جاتا ہے۔ ایسے زمانہ میں ظہیر احمد صدیقی جیسے افراد ہوا کے تازہ جھونکے کی طرح آتے ہیں۔ ہوا کا جھونکا ٹھہرتا کب ہے، چنانچہ وہ بھی ٹھہرے نہیں، چلے گئے، وقت سے پہلے، عزائم کی تکمیل سے قبل۔ اس دور میں جب زندگی کی توقع زیادہ ہوگئی ہے، عمریں بالعموم طویل ہوگئی ہیں، برسرروزگار لوگ جو خلق کی خدمت کرنا چاہتے ہیں، جنہیں تخلیقی کام سے دلچسپی ہے وہ فرایض منصبی سے سبکدوشی کا انتظار کرتے رہتے ہیں کہ یکسوئی کے ساتھ وہ کام انجام دیں گے جس پر ان کے ذوق نے کمر ہمت باندھ رکھی ہے۔ ظہیر احمد صدیقی کو زندگی نے اس کا موقع نہیں دیا۔ ان کی عمر نے وفا نہیں کی۔ دہلی یونیورسٹی میں پروفیسری سے ریٹائرمنٹ کے بعد وہ اپنے ادبی اور تخلیقی عزائم کی تکمیل کے لئے مہلت نہ پا سکے۔ سبکدوش ہو کر وہ اپنے وطن ثانی علی گڑھ چلے گئے جہاں انہوں نے آنکھیں کھولی تھیں جہاں اپنے والد ماجد مولانا ضیاء احمد بدایونی سے، جو فارسی زبان وادب کے فاضل اجل

تھے۔انہوں نے تعلیم اور تربیت پائی تھی۔تعلیم بھی کیسی تعلیم؛تربیت بھی کیسی تربیت۔ تعلیم اور تربیت کا ذکر آگے چل کر کیا جائیگا۔تعارفی سُطور کو حکیم ثنائی کے ایک قطعہ پر پایان تک پہنچاوں گا۔

با ہمہ خلقِ خدا گر چہ ازاں بیشتر گُمرہ و کمتر بَرہند

آنچناں زی کہ چو میری بر ہی نہ چناں زی کہ چو میری بر ہند

(مخلوقِ خدا کے درمیان، جس میں بیشتر راہ سے بھٹکے ہوئے اور کمتر راہ پر ہیں، اس طرح زندگی گزارو کہ جب مَرو تو تمہیں اُس سے نجات مل جائے، اس طرح نہ جیو کہ اُسے تم سے نجات ملے)۔

ظہیر احمد صدیقی کو قبل از وقت موت کی شکل میں پروردگار نے گمراہوں کی بستی سے اٹھالیا، اس معاشرہ سے نجات دلا دی جسے نیک و بد کی تمیز نہیں رہی تھی۔ان کے جانے سے پہلے قدرت نے یہ انتظام بھی کر دیا تھا کہ نسیاں یاد کو محو کر دے۔زبان پر بے ساختہ غالب کا یہ مصرع آرہا ہے۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

آزاد مردی سے مراد اقدار سے آزادی ہرگز نہیں کہ وہ ان کا اسیر تھا۔آزاد ضرور رہا وہ تمام عُمر چالاکیوں سے، سازشوں سے، فریب کاریوں سے، چاپلوسیوں سے ،خودغرضیوں سے، تنگ دلی اور حسابی رُخ اور روش اور خفیف الحرکتی سے۔راقم السطور کو حیرت ہے کہ وہ کیونکر ایسا کر سکا، ایسے ماحول میں رہ کر جہاں مادّیت آنکھوں پر چھائی ہوئی تھی اور جہاں ادب اور تنقید کے بجائے سازش اور خودغرضی کا دور دورہ تھا۔اردو زبان انحطاط کے دور سے گزر رہی ہے؛اس کے ثبوت اور شواہد ہر طرف بکھرے ہوئے ہیں، منجملہ ان کے ایک ثبوت بعض یونیورسٹیوں کے اردو شعبوں میں دستیاب ہوگا۔زبان

وادب کی کساد بازاری میں غیر نصابی ذہانتیں چکنے لگتی ہیں۔ کہ بقا اور ترقی کا فی زمانہ ذریعہ یہی رہ گیا ہے۔

ظہیر احمد صدیقی ایک ایسے خانوادہ کے فرزند تھے جو بہ یک وقت علم و فضل اور زہد و تقویٰ سے آراستہ تھا۔ ان کے والدِ ماجد مولانا ضیاء احمد بدیونی عالم و فاضل تھے اور متقی اور پرہیز گار بھی۔ قصاید خاقانی کے ہفتخواں کو وہ رزم روندی کی طرح طے کرتے تھے۔ ان قصاید کا ہر شعر تلمیحات سے گرانبار اور فہم کے لئے دشوار گزار ہوتا تھا، ایک جیہ قصیدہ کے پہلے دو شعر یاد رہ گئے ہیں:

صُبحدم چوں کلۂ بنددآہِ دُودآسائے من — تاشفق درخوں نشیند چشم شب پیمائے من

دستِ آہنگر مرادر مارِ ضحا کی کشید — گنجِ افریدوں چہ سود اندر دلِ دانائے من

اور تلمیحات کو ہمارا مشکل پسند اور بلند آوازہ شاعر ضایع و بدایع سے جوڑتا تھا۔ جسیہ شاعری میں شاید عالمی اَدب اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ وہ درد کو ضبط نہیں کرتا۔ کرب کے عالم میں چیختا ہے اور چیختے وقت فشارِ کرب سے اس کا وسیع مطالعہ اور اس کا ذخیرۂ علم اُمڈتا چلا آتا ہے۔ اس کی تمثیلی صلاحیت انمل بے جوڑ اشیا اوصاف کو رشتۂ شباہت سے باندھ دیتی ہے۔ لیکن یہ ایک جملۂ معترضہ تھا۔ مقصد اس وقت صرف اس عبور کو بیان کرنا ہے جو فارسی ادب پر مولانا ضیاء احمد کو تھا۔ بدایوں کا شمار مردم خیز شہروں میں ہوتا تھا اور یہ اردو ادب کے بڑے مراکز میں تھا۔ مولانا ضیا احمد بدایونی کے خاندان کے ہر فرد کو شعر و ادب سے حقیقی وابستگی تھی۔ ظہیر احمد صدیقی کو یہ ذوق و شوق ورثہ میں ملا اور اس ورثہ کا ایک جزو بلکہ جزو غالب تھا حکیم مومن خاں مومن کی عظمت کی بحالی اور ان کی پُر پیچ مضمون آفرینی کی پر۔رہ گشائی۔ ظہیر احمد صدیقی نے تفہیمِ مومن کی آبائی مہم کو آگے بڑھایا۔ ان کا تنقیدی سرمایہ معتد بہ ہے لیکن راقمِ سطور کو سروکار ان کی شخصیت سے ہے۔

ظہیر احمد صدیقی کے دودمانِ والا تبار اور ان کے والد ماجد ستودہ صفات و

فضایل مآب کے تذکرے سے آپ یہ نتیجہ نہ نکال بیٹھئے کہ وہ (ظہیر احمد صدیقی) زہدہ تقویٰ کے پیکر تھے اور زہد خشک کے ترجمان۔ وہ دراصل جدید نظامِ تعلیم کے پروردہ ایک خوش عقیدہ مسلمان تھے جنہیں اُس دور کے شرفاء کی طرح حفظِ وضع کا پاس تھا۔ خاندانی روایات، دینداری کے ماحول اور والدین کی تربیت نے انہیں راست کرداری میں راسخ اور ماحول کی مدافعت کے لئے مُستعد بنا دیا تھا۔ راقم سطور نے ان کی پاکئ دامن کی حکایت کو طول نہیں دیا ہے۔ وہ صرف یہ کہنا چاہتا تھا کہ ان کی پُشت ہمیشہ پانی سے اوپر رہی۔

مرحوم کے ایک وصف کی طرف اشارہ کر کے اپنی بات کو ختم کروں گا۔ روایتی وضعداری اور موروثی سنجیدگی کے باوصف ان کے مزاج کی ترکیب میں مزاح شامل تھا۔ میں نے اسکی جھلکیاں دیکھیں لیکن یہ وصف کھل کر میرے سامنے نہیں آیا۔ وجہ ظاہر ہے۔ میں انکے والد ماجد کا شاگرد تھا اور ان کے مقابلہ میں عمر کی اس منزل میں تھا جسے ''میزنین'' کہہ سکتے ہیں۔ حفظ مراتب نے ان کی ظرافت کی کلی کو میرے سامنے کھلنے نہیں دیا۔ لیکن ان کی خوشنما شگفتگی ڈھکی چھپی نہ رہی۔

مجھے افسوس ہے کہ ایک عرصہ تک ایک ہی زمانے میں دلّی کے ساکن ہونے کے باوجود ان سے ملاقاتیں کم رہیں۔ ہم دونوں اس وقت کی دِلّی کے دو سروں پر رہتے تھے۔ ایک بار البتہ ہم ایک مہم میں شریک ہوئے۔ مولانا محمد علی جوہر کے یوم ولادت کی صدی۔ یہ تھی تقریب۔ دوڑ دھوپ اور انتظام بیشتر پروفیسر ظہیر احمد صدیقی کے حصہ میں آیا۔ پیش رفت کی اطّلاعات سے میں بہرور ہوتا رہا۔ ہم صدر مملکت شری سنجیو یا ریڈی سے اس سلسلہ میں ملنے گئے تھے۔ دھکّہ سا لگا جب انہوں نے ہمارے ممدوح کا ذکر ہلکے انداز میں کیا۔ عوامی حافظہ کتنا کمزور ہوتا ہے۔ مولانا انڈین نیشنل کانگریس کے صدر تھے اور تحریکِ خلافت کے روح رواں اور گاندھی جی کے مساوی سطح پر شریک کار۔

اور یہاں تو سوال عوامی نہیں خواصی حافظہ کا تھا۔ صدرِ محترم کو ہم یہ احساس دلا کر نامراد واپس آئے کہ انہوں نے مولانا محمد علی کا احترام شایانِ شان نہیں کیا۔ تاہم صدی تقریبات بہ احسنِ وجوہ انجام پائیں۔ اقبال کا قول فیصل ایسے مواقع پر یاد آتا ہے۔

"ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

ضعفِ قلم کی سزا ہم کو یہ ملتی رہی ہے کہ مسلم رہنماؤں کے نام تاریخ ہند سے محو ہوتے چلے گئے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کسی طرح بچ گئے۔

ظہیر احمد صدیقی نے تدریس و تحقیق کے علاوہ دلی کے جلسوں میں اور میزبان یونیورسٹیوں کے سمیناروں میں اردو اور اس کے ادب کا پرچم بلند کیا۔ ان کے قلم نے ان کے قدم کو ہمعناں پایا۔ انجمن ترقی اردو، غالب اکیڈیمی اور دہلی اردو اکیڈیمی سے وہ منصباً اور عملاً متعلق رہے۔

میرے علیگڑھ کے دور کا ایک حصہ پُر آشوب رہا۔ اصلاح کے خارزار میں قدم رکھیے تو اصلاح دشمن اور جاگیر دار طاقتیں درپئے آزار ہو جاتی ہیں۔ ارزاں مقبولیت کو پیٹھ دکھایئے اور مستقبل کی تعمیر سے لَو لگایئے تو بہت سے دشمن پیدا ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ مخالف کا ایک طوفان اُٹھا جس میں بعض ذی ہوش افراد بھی بہک گئے۔ افواہوں نے بہتوں کو متزلزل کر دیا۔ پروفیسر ظہیر صدیقی کے پائے ثبات کو تاہم جنبش نہیں ہوئی۔ انہوں نے میرے متعلق اپنی رائے کا جو اظہار کیا اسے میں فروتنی کے باوصف تمغۂ افتخار سمجھتا ہوں۔ "کوئی معاملہ سید حامد کے پاس جاتا ہے تو ہم مطمئن ہو جاتے ہیں کہ فیصلہ صحیح ہوگا، کوئی اثر کارفرمانہ ہو پائے گا"۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ میرا اثاثہ ہے، یہی زندگی بھر کی کمائی ہے۔

مجھ میں نہ تحقیق کی صلاحیت ہے، نہ لکھنے کی، مجبور ہو جاتا ہوں ورنہ دل میں یہ

خیال کروٹیں لیتا ہے کہ ایسے خاندانوں کی جنہیں علم وفضل اور شرافت اور راست روی نے امتیاز بخشا ہے، رودادیں لکھی جاتیں۔ کیسے لوگ تھے یہ اور کیسے خاندان۔ ان کی سرگزشت نہ لکھی گئی تو آنے والے پیڑھیاں انکا تصور بھی نہ کرسکیں گی۔ مولانا ضیا احمد کے خاندان جیسے خاندانوں نے شرافت اور تہذیب اور انسان دوستی، صداقت اور ایثار اور علم کی روایت کو زندہ رکھا اور اپنی مثال اور اپنے اثر سے پورے معاشرہ کی شیرازہ بندی کی اور اس کے افراد کو بکھرنے نہ دیا۔

☆☆☆

پروفیسر مسعود حسین خاں،
سابق وائس چانسلر،
جامع ملیہ اسلامیہ، دہلی۔

پروفیسر ظہیر احمد صدیقی اور دانش وری

پندرہ بیس برس کی بات ہے کہ شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی کی ایک بارنگ شخصیت سے جب ظہیر احمد صدیقی صاحب کا تذکرہ آیا تو ان کے رفیق شعبہ نے بے ساختہ طور پر کہا ''ارے وہ تو مولوی ہیں''۔

مجھے اس بات کا علم تھا کہ ظہیر صاحب کا تعلق بدایوں کے ایک علمی خانوادے سے ہے اور انکے والد ماجد، جو فارسی ادبیات کے مستند عالم اور اردو شعر وسخن کے ایک صاحب ذوق انسان تھے۔ علی گڑھ میں مولوی ضیا احمد بدایونی کے نام سے جانے جاتے تھے۔ جن سے مجھے بھی نیازمندی حاصل رہی ہے۔

حیدرآباد دکن میں 'مولوی' ہر پڑھے لکھے آدمی کے نام کے آگے لگا دیا جاتا تھا، شمالی ہند میں مولوی' اور 'ملاّ' خاص معنیاتی اختلاف کے ساتھ استعمال کئے جاتے رہے ہیں۔ میرے ذہن میں مولوی کی تعریف میں ایک بند ذہن رکھنے والا انسان آتا ہے۔ اس لئے عرصہ دراز سے میں کہتا اور لکھتا آیا ہوں کہ ہر تحریک کے (بہ شمول اشتراکیت) مولوی ہوتے ہیں۔ جو اس تحریک کی بدنامی کا باعث بن جاتے ہیں۔

بہر حال مولوی ضیاء احمد بدایونی یا ان کے پسر نامور ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی

اسلامی شعائر اور روایات کا احترام کرتے ہوئے اس قسم کے مولوی نہیں تھے جن سے گریز واجب ہے۔ دونوں مومن خاں مومنؔ کے ان تھک شارح اور مفسر ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ ان کی اس (سید پٹھان؟) شاعر سے دلچسپی اس بات کی کافی ضمانت ہے کہ ان کی ''صوفیت'' تو مسلّم ہے، 'مولویت' البتہ مشتبہ ہے۔

اس کے ثبوت میں میں صرف ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی کے بعض معتبر تنقیدی مضامین کے مجموعوں کے نام لوں گا جن میں ''اردو ادب میں جمالیاتی اقدار'' ''فکری زاویے'' احساس وادراک' 'جدید شاعری' اور تازہ مجموعہ مضامین' 'میزان قدر' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ مستزاد ہیں انکی 'صوفیت' پر 'مومن شخصیت وفن'، 'مومن دہلوی' مومن کے دیوان اور عقاید کا انتخاب (مع مقدمہ وشرح) اور مومن کے مکاتیب فارسی (انشائے مومن مع شرح)۔

ذاتی طور پر مومن کے ادبی مرتبے کے بارے میں میرا ان سے اختلاف رہا ہے۔ طرفدارِ غالب ہونے کی وجہ سے میرا اصرار رہا ہے کہ ہر چند غالبؔ نے مرگ مومن پر اپنی سیاہ پوشی کا اعلان کیا تھا اور اگر روایت صحیح ہے تو ان کے ایک شعر کے بدلے میں اپنے دیوان اردو کی پیش کش بھی کی تھی، تاہم غالبؔ کے لئے 'فخر مومن' بہت زیادہ باعث فخر نہیں تھا۔ انہوں نے اپنے والد ماجد کی طرح مومن کے ساتھ ایک عمر بسر کی ہے اور وہ اس نازک مزاج اور نازک خیال شاعر کی تمام شعری نزاکتوں سے بخوبی واقف ہیں۔ انکے گھر کا کلچر مومن کا کلچر ہے!

اس وقت میں ان کے تنقیدی شعور کی بات ان کے نئے مجموعہ مضامین ''میزان قدر' کے ایک مضمون ''اردو میں دانشوری کی روایت'' کے حوالے سے کروں گا جس سے ثابت ہو جائے گا کہ وہ تنقید میں ایک گہری بصیرت اور وسیع نقطۂ نظر کے مالک ہیں۔ انکی امتیازی خصوصیات لفظ 'میزان' سے عبارت ہے اور وہ نہایت نپے تلے انداز اور مضبوط و

فہرست

عنوان	مصنف	صفحہ
۱۔ پیش لفظ	مسز افتخار بیگم صدیقی	۷
۲۔ کچھ اپنے بارے میں	پروفیسر ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی	۹
۳۔ یادش بخیر	سید حامد	۲۵
۴۔ ظہیر احمد صدیقی اور دانشوری کی روایت	پروفیسر مسعود حسین خاں	۳۱
۵۔ ایک جائزہ جدید شاعری از پروفیسر ظہیر احمد صدیقی	پروفیسر اسلوب انصاری	۳۶
۶۔ مثالی استاد، ذمہ دار ادیب اور خوش ذوق رفیق کار	پروفیسر قمر رئیس	۴۱
۷۔ صدیقی صاحب	پروفیسر شمیم نکہت	۴۶
۸۔ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی	پروفیسر عبدالحق	۵۳
۹۔ پروفیسر ظہیر احمد صدیقی بہ حیثیت انسان	پروفیسر عبدالمغنی	۶۲
۱۰۔ ظہیر احمد صدیقی میری نظر میں	ڈاکٹر سید محمد عقیل	۶۴
۱۱۔ ظہیر احمد صدیقی۔ تنقید کے کچھ پہلو	ڈاکٹر علی احمد فاطمی	۷۱
۱۲۔ پروفیسر ظہیر صدیقی اور مومن شناسی کی روایت	ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری	۷۹
۱۳۔ دیوان درد۔ ایک جائزہ	پروفیسر عتیق احمد صدیقی	۸۸
۱۴۔ اخلاقی اقدار اور اردو ادب	پروفیسر معز علی بیگ	۹۶
۱۵۔ ظہیر بھائی۔ کچھ یادیں	پروفیسر آفاق احمد	۱۰۳
۱۶۔ ظہیر احمد صدیقی۔ ایک مختصر خاکہ	ڈاکٹر مغیث الدین فریدی	۱۰۷
۱۷۔ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی	سید ضمیر حسن دہلوی	۱۱۲
۱۸۔ درد کی شاعری کا ایک پہلو اور ظہیر احمد صدیقی	ڈاکٹر محمد فیروز	۱۲۰
۱۹۔ نقش ظہیر۔ ''فانی کی شاعری''	ڈاکٹر محمد نفیس حسن	۱۲۸

مربوط نثر میں اپنے خیالات کو پیش کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ نثر نگاری کا یہ انداز آج کل کے بہت کم ادیبوں کو حاصل ہے اس لئے کہ ان میں سے اکثر کی ہمارے کلاسیکی ادب میں ناکافی تربیت ہوئی ہے اور بعض نااہل انگریزی کے زور پر اردو تنقید میں در آئے ہیں!

اردو میں ''دانش'' 'دانش مندی' 'دانشوری' قدیم زمانے سے مستعمل ہیں:

دانش تری، نہ کچھ مری دانش وری چلے (ذوقؔ)

لیکن 'دانشور' اور 'دانشوری' کا نیا مفہوم جو انگریزی کے لفظ Intellectual اور Intellectualism کے معنوں کا حامل ہو حال کا دخیل ہے۔ اسمیں ذی فہم' دانا، روشن خیال سارے مفاہیم آجاتے ہیں۔ 'دانشور' دانشکدہ، (یونیورسٹی) سے غیر متعلق ہوتے ہوئے بھی مسائل حیات و کائنات پر ایک عمومی نظر اور رائے رکھتا ہے۔ وہ اتنا ماہر، کا رتبہ نہیں رکھتا جیسا کہ ایک مفکر کا۔

'دانش' اور 'دانشوری' کے ان مفاہیم کو پیش نظر رکھ کر ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی نے اپنے مضمون ''اردو میں دانشوری کی روایت'' میں اردو کے بعض اکابرین کا تذکرہ کیا ہے۔ ان کابرین میں' جیسا کہ درج ذیل فہرست سے ظاہر ہوگا، ہر قسم کے لوگ موجود ہیں۔ شاعر، ادیب، عالم دین، اہل سیاست وغیرہ۔

غالب، حالی، سرسید، شبلی، ابوالکلام آزاد، علامہ اقبال، سید سلیمان ندوی، نیاز فتح پوری، مولانا عبدالماجد، مولوی عبدالحق، شاہ معین الدین ندوی، مسعود حسن رضوی، رشید احمد صدیقی، خواجہ احمد فاروقی، آلِ احمد سرورؔ، کلیم الدین، غلام السیدین، یوسف حسین خاں، فراقؔ مالک رام، قاضی عبدالودود، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، امتیاز علی عرشی، مولانا عبدالحسن ندوی، مشیر الحق، ڈاکٹر عبدالعلیم۔

اس فہرست پر نظر ڈالنے سے فوراً ظاہر ہو جاتا ہے کہ ظہیر احمد صدیقی صاحب کے پیش نظر دانشوری، کا کوئی واضح تصور نہیں ہے۔ ورنہ بعض غیر دانشور قسم کے حضرات اس لسٹ میں جگہ نہ پاتے یا علمائے دین کے ساتھ نیاز فتح پوری اور ڈاکٹر عبدالعلیم کا نام نہ ہوتا۔

حقیقت یہ ہے کہ دانشوری کے صحیح مفہوم میں یعنی فلسفیانہ نظر رکھنے والے حضرات ان میں بہت کم ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا نام ہے لیکن مصنف ان کے رول سے پوری طرح مطمئن نظر نہیں آتا۔ اقبال کا ذکر بھی سرسری ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کا تو سرے سے غائب ہے۔ ایسے علماء دین کے نام کافی ہیں جو اپنے میدان میں تو منفرد ہیں لیکن جو حیات و کائنات کے عمومی مسائل پر بہت گہری نظر نہیں رکھتے۔ مجھے اردو کے دانشوروں کی مختصر فہرست بنانے کا اختیار دیا جائے تو میں صرف پانچ سات ناموں پر اکتفا کرونگا۔

سرسید، شبلی، اقبال، ابوالکلام آزاد، سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابد حسین اور مولانا ابوالحسن ندوی، ان میں سرسید اقبال اور ابوالکلام آزاد خاص طور پر ہماری توجہ کے مستحق ہیں کہ یہ اپنے فکری چوکھٹے کے باہر بھی جھانک کر دیکھ سکتے تھے۔ بہر حال مضمون زیر بحث میں ظہیر احمد صدیقی نے اس بات کا وافر ثبوت دیا ہے کہ وہ اسلامی ذہن رکھتے ہوئے مولویانہ ذہن نہیں رکھتے ورنہ نیاز فتح پوری اور ڈاکٹر عبدالعلیم جیسے حضرات کو اپنی فہرست میں جگہ نہ دیتے۔ دقت یہ ہے کہ جب ہم کسی نئی اصطلاح کے سانچے میں مواد کو ڈھالتے ہیں تو اکثر اوقات ابہام اور اختلاط مبحث کا شکار ہو جاتے ہیں۔ مصنف نے اس دقت کے باوجود قسم بندی کی جو کوشش کی ہے اور اکابرین اردو کو نئے خانوں میں بٹھایا ہے۔ اس سے ان کی بصیرت اور اپنے عہد کے ادب اور فکر سے گہری واقفیت کا ثبوت ملتا ہے۔

تنقید ادب میں دانشوری کا سب سے بڑا ثبوت اسی قسم کے مضامین میں ملتا ہے۔ جہاں مصنف تفصیل و تحقیق میں جائے بغیر اپنی مجموعی معلومات کی بنا پر بعض مفروضات قائم کرتا ہے اور اُن پر اپنے عصر کی فکری روؤں کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ علم و ادب میں یہی بلوغت کی علامت ہے۔

میرے خیال میں دانشوری کے لئے ایک فلسفیانہ ذہن کا ہونا ضروری ہے۔ موجودہ تعلیم کا سارا زور مہارت، اور تخصیص پر ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیمی منصوبہ بندی روٹی روزی اور ملازمت کے ارد گرد ہے۔ چنانچہ ہمارے بڑے تعلیمی اداروں (مثلاً علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ) کے نصابات اسی ضرورت کے پیش نظر ڈھالے جا رہے ہیں اور نتیجہ یہ ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا سائنس کا ایک ذہین پروفیسر مجھ سے پوچھتا ہے کہ سرسید کہاں دفن ہیں؟ یہ لطیفہ نہیں عبرت ناک حقیقت ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ بھی جسے ''قومی+اسلامی'' تہذیب کا گہوارہ بنانے کے لئے وجود میں لایا گیا تھا اپنی اصل ڈگر سے ہٹ کر ''ماس کمیونی کیشن'' کو سب کچھ سمجھنے لگا ہے۔ پٹریوں کے بدل جانے کی وجہ سے اور خاص کر ان اداروں میں اردو کے زوال کے بعد یہ کہنا مشکل ہے کہ ہمارے سماج میں ''دانشوروں'' کے پیدا ہونے کے کیا امکانات ہیں۔ پیشہ ور تو پیدا ہوں گے، دانشور نہیں۔

ظہیر احمد صدیقی صاحب نے دانشوری کی نہایت عمدہ تعریف کی ہے لیکن اسکی مثالیں وہ خاطر خواہ نہ دے سکے۔ انہوں نے اردو بولنے والی نئی نسل میں اس کے باقی رہنے کے امکانات سے بھی گریز کیا ہے۔

☆☆☆

پروفیسر اسلوب احمد انصاری
شعبہ انگریزی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ایک جائزہ - جدید شاعری از ظہیر احمد صدیقی

جدید شاعری، ظہیر احمد صدیقی صاحب کے ان تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ جو وقتاً فوقتاً اردو کے بعض اہم شاعروں جیسے فراق اور فیض پر ان کے قلم سے نکلے ہیں۔ اس کے علاوہ بعض دوسرے شاعروں کے کارناموں پر بھی انہوں نے اظہار خیال کیا ہے، جیسے سیماب اکبرآبادی، جان نثار اختر اور معین احسن جذبی سیماب کی غزل گوئی کا محاکمہ کر کے انہوں نے ایک بڑی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ کیوں کہ ان کی طرف قارئین کی توجہ کم رہی ہے اور سیماب کی استادانہ قوت گویائی کا جیسا شہرہ ان کے اپنے زمانے میں تھا، وہ نامعلوم وجوہات کی بناء پر زمانۂ مابعد میں قائم نہیں رہ سکا۔ جاں نثار اختر کی شہرت بھی بہت گریز پا ثابت ہوئی۔ ان کا تعلق شعراء کے جس گروہ سے تھا، یعنی مجاز، مخدوم اور کیفی اعظمی وغیرہ، وہ سب ہی ترقی پسند تحریک سے گہرے طور پر وابستہ اور سرخ پرچم اٹھائے رکھنے کے سبب اس تحریک کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ جلد اپنی وقعت کھو بیٹھے۔ ویسے بھی ان سب کی شاعری حد درجہ اکہری ہے اور اس میں زندہ رہنے کی قوت نفی کے برابر ہے۔ بہتر ہوتا اگر ظہیر احمد صدیقی نے معین احسن جذبی کی معدودے چند اچھی نظموں اور غزلوں کو اپنی تنقید اور احتساب کا موضوع بنایا ہوتا، بجائے ڈاکٹر ذاکر

حسین مرحوم کے نام ان کے دلچسپ قصیدے اور آل احمد سرور کے نام ان کی مہمل اور بے تکی نظم پر وقت ضائع کرنے کے۔ اس پر مستزاد یہ کہ جذبی اور آل احمد سرور کے درمیان ڈھکی چھپی رنجش کو حالی اور غالب کے درمیان مراسلت سے جا ملایا چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک، برطانوی شاعر رابرٹ برنس، نظیر اکبر آبادی اور اختر اقبال کمالی کی نظموں کا تقابلی مطالعہ بہت دلچسپ ہے۔ گو ان تینوں شعراء کا مرتبہ کچھ ایسا بلند نہیں۔ لیکن ان کی نظموں میں موضوع کے اعتبار سے ایک طرح کی ہم آہنگی اور مماثلت ضرور پائی جاتی ہے۔ اور یہ امر بھی قابل غور ہے کہ تینوں نے اس حقیقت پر زور دیا ہے کہ انسان چاہے کسی طرح کے حالات و حوادث میں گھرا ہو، اس کا منصب اور ذمہ داریاں کیسی کچھ کیوں نہ ہوں اس کی آدمیت اس کی اصل پہچان اور اس کا اصلی جوہر ہے۔ نظیر اکبر آبادی کو موجودہ دور میں جمہوریت، سیکولرزم اور ہندوستانیت کے حوالے سے جو اہمیت دی گئی ہے، وہ ان کے استحقاق سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے۔ نظیر عوامی شاعر ہیں، ان کی شاعری خواص یعنی Elite کے لیے نہیں ہے۔ ظہیر احمد صدیقی نے یہ اچھا کیا کہ ایک نسبتاً غیر معروف لیکن پختہ کار شاعر اختر اقبال کمالی کا تعارف اردو قارئین سے کرا دیا اور ان کی نظم کا متن بھی کتاب کے آخر میں دے دیا۔ تاکہ اس کتاب کے پڑھنے والے کمالی صاحب کے صاحب کمال ہونے کا اندازہ خود بھی لگا سکیں۔ اس مجموعے میں مجروح سلطانپوری کی ایک غزل اور فیض کی دو نظموں کا تجزیاتی مطالعہ بھی پیش کیا گیا ہے، جو قابلِ قدر ہے۔ اس میں فیض کی شاعری پر الگ سے ایک تفصیلی مضمون بھی ہے جو توجہ طلب اور چونکا دینے والا ہے۔ اس امر پر زور دینا کہ فیض کی شہرت کو جو چار چاند لگے وہ ان کے حق میں سیاسی تشہیر و ترسیل کی وجہ سے لگے، نہ کچھ زیادہ موزونیت رکھتا ہے اور نہ زیادہ صحیح ہے۔ آج کی دنیا میں اشاعت و تشہیر کا اثر ضرور پڑتا ہے۔ لیکن نوعی اعتبار سے فیض اپنے تمام ہم عصر شعراء پر فوقیت رکھتے ہیں۔ غزل گوئی میں البتہ ان کا درجہ مجروح سلطان پوری سے فروتر ہے۔ راقم الحروف کی رائے میں ترقی پسند تحریک نے بس ایک ہی شاعر پیدا

کیا، اور وہ فیض ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے سیاسی معتقدات اور تعہد کو اپنے خون میں حل کر کے اور استعاراتی زبان میں نہایت سلیقے کے ساتھ پیش کیا۔ شاعری کو سیاسی اغراض و مقاصد کے حصول کا آلہ کار نہیں بنایا۔ جیسا مخدوم محی الدین، سردار جعفری اور اسی طرح کے دوسرے ان گنت شعراء کرتے رہے، جو تخلیقی عمل کی ماہیت سے کلیۃً ناآشنا معلوم ہوتے ہیں۔ جن دو جدید شاعروں نے ترقی پسند تحریک کی Ideology کے مضر اثرات سے اپنے آپ کو بچائے رکھا ان میں معین احسن جذبی اور مجروح سلطان پوری کا نام بجا طور پر لیا جا سکتا ہے۔ ظہیر صدیقی نے فیض کے ساتھ انصاف نہیں کیا، جب انہوں نے یہ کہا: ''ساحر، مجاز، جاں نثار اختر اور مخدوم کی شاعری میں جا بجا فیض کے دھیمے، محتاط استعارات و رموز کے بار سے دبے ہوئے اندازِ تغزل کے مقابلے میں ایک زیادہ زندہ اور توانا رومانی لے ملتی ہے۔ فکری اعتبار سے بھی فیض کی شاعری میں تہی دامنی کا احساس بڑی شدت سے ہوتا ہے'' (ص ۸۵)۔ ساحر، مجاز، جاں نثار اختر اور مخدوم (اور سردار جعفری) کا بھلا فیض سے کیا مقابلہ، وہ فیض کا قد و قامت کہاں سے لائیں گے۔ ان سب کی گھن گھرج کے بالمقابل فیض کی شاعری ایک شائستہ ذہانت کی پیداوار ہے۔ اور ان کے لہجہ ہائے زیر لبی کا ان شعراء کی چیخ پکار، ادعائیت اور نیم پختگی سے کیا علاقہ ظہیر احمد صدیقی نے فیض کی اہم اور قابلِ قدر نظموں اور غزلوں کے تجزیے سے شاید عمداً گریز کیا ہے فیض کا شمار اس دور کے انتہائی اہم شاعروں کے زمرے میں کیا جانا قرین انصاف بھی ہے اور ایک بین حقیقت بھی، جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ ان کے ہاں رومانیت کی طرف رغبت اور ان کا سیاسی تعہد باہم شیر و شکر ہو گئے ہیں۔ گو اس سے پیدا شدہ چاشنی جو ان کے استعاراتی انداز گفتار میں پیدا ہو گئی ہے، وہ ذرا کچھ زیادہ ہی ہے، اس مجموعے کا سب سے اچھا مضمون، جو اس مجموعے کا عنوان بھی قرار پایا ہے، جدید شاعری پر ہے جس میں ظہیر صدیقی نے بڑی جامعیت اور پختہ کارانہ انداز میں ان تمام تشکیلی عناصر کی نشان دہی کی ہے۔ جو جدید شاعری کے

منظرِ عام پر آنے کے ذمے دار کہے جا سکتے ہیں، البتہ اس مضمون میں مثالوں کی کمی کافی کھٹکتی ہے۔ اگر وہ اپنے عمومی بیانات یا مسائل کے تجزیے کو جدید شعراء کے کلام کی طرف مختصر اشاروں سے مستحکم کرتے تو مضمون کی افادیت اور بڑھ جاتی۔ مجروح کی ایک غزل اور فیض کی دو نظموں کے جو تجزیاتی مطالعے اس کتاب میں شامل کیے گئے ہیں۔ وہ ہلکے اور سرسری سے ہیں۔ جدید شاعری پر مضمون البتہ مقابلۃً ٹھوس اور بھاری بھرکم ہے۔ اس سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ تعمیمات پر گفتگو کرنا یعنی مسائل کا براہِ راست استقصاء کرنا الگ بات ہے اور کسی ادبی فن پارے کو تحلیل اور تجزیے کا مورد بنانا اور اسکی گرہوں کو کھول کر اس کے اندرون میں داخل ہونا خاصا ذہنی ریاض اور انتقادی تربیت کا طلب گار ہے۔ موخرالذکر عمل ہی سے دراصل ادب کی تحسین شناسی کا راز کھلتا ہے۔

کتاب کے پیش لفظ میں ظہیر صدیقی نے اختر انصاری مرحوم کے اس خط کا اقتباس دیا ہے، جس میں انہوں نے جدید شاعری پر مضمون کو بجا طور پر سراہا ہے اور اس کوتاہی کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ جدید شاعری کے خدوخال کی تشکیل میں ۱۹۱۷ء کے انقلاب روس اور ہندوستان میں ترقی پسند تحریک کے واسطے سے مارکسی معاشرتی فلسفے کے جو اثرات مرتب ہوئے اور ان کا جو انعکاس اردو ادب میں نظر آیا، اسے انہوں نے بالقصد یا بے جانے بوجھے نظر انداز کیا ہے، یہ اعتراض بڑی حد تک صحیح اور روا ہے۔ کیونکہ مارکسی فلسفے کے اثرات کی طرف توجہ کی جانی چاہئے تھی۔ یہاں بہرصورت یہ اضافہ کرنے کو دل چاہتا ہے کہ کاش اختر انصاری مرحوم چند سال اور زندہ رہ جاتے تاکہ وہ اپنی آنکھوں سے یہ عبرتناک منظر بھی دیکھ لیتے کہ جس انقلاب روس (۱۹۱۷ء) کو انہوں نے انسان کی دس ہزار سالہ تاریخ کا سب سے زیادہ مہتم بالشان واقعہ قرار دیا تھا، اس کا تار و پود پلک جھپکتے میں یعنی صرف ۷۵ سال کے اندر اندر بکھر کر رہ گیا۔ (۱۹۱۷ء) کا انقلاب ایک انقلاب آفریں واقعہ ضرور تھا۔ اور اس کے مرتب کردہ اثرات دوررس بھی تھے لیکن ایسے بھی نہیں کہ ان کا ذکر اس قدر مبالغہ آمیز انداز سے کیا جاتا۔ اس سے کہیں

بڑھ چڑھ کر تابناک اور محیر العقول واقعہ اسلام کی وہ تحریک تھی، جو سرزمین حجاز سے چشمۂ حیات کی طرح پھوٹی، وہ اسلام جو ایک لازوال حقیقت ہے اور جس نے تاریخ انسانی کے دھارے کا رخ موڑ دیا۔ قرآن حکیم جسے نبی کریم پر نازل کیا گیا، تاریخ، سیاست قانون یا علم مدن کی کوئی ایسی کتاب نہیں، جس میں یہ تفصیلات درج کی گئی ہوں۔ بنیادی طور پر یہ رشد و ہدایت کا صحیفہ اور ابدی سچائی کی تجسیم ہے۔ اس میں اس سے ماسوا انفرادی اور اجتماعی سطح پر تہذیب و اخلاق کے واسطے سے وسیع پیمانے پر زندگی کی تنقیح اور معاشرے کی تنظیم کی طرف اشارے بھی موجود ہیں۔ اسلام نے جس معاشرے کی تعمیر و تشکیل کی تھی وہ ایک انوکھا معاشرہ تھا، جس میں آزادی اور ذمے داری اور عدل و احسان رواداری، سب کے لیے بیک وقت گنجائش رکھی گئی تھی۔ جب تک قرآن حکیم ان گنت اور لاتعداد انسانوں کے سینوں میں محفوظ اور ان کے لیئے ایک زندہ قوتِ محرکہ ہے۔ اسلام کی حقانیت پر کبھی آنچ نہیں آسکتی۔

تنقیدی مضامین کا یہ مجموعہ ہمارے آج کے تنقیدی سرمائے میں ایک دلچسپ اضافہ ہے۔ ظہیر صدیقی اپنے خیالات اور مفروضات و قیاسات کے بلا تامل اظہار پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔ ان کے انداز بیان میں سنجیدگی اور خوشگواری کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ ان میں ایک طرح کی سادگی اور معصومیت ہے اور وہ قاری کو لبھانے اور اسکی توجہ کو اپنی گرفت میں رکھنے کے ہنر سے بخوبی واقف معلوم ہوتے ہیں۔

☆☆☆

پروفیسر ڈاکٹر قمر رئیس
شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی۔

پروفیسر ظہیر احمد صدیقی

مثالی استاد ذمہ دار ادیب خوش ذوق رفیق کار

ربع صدی سے کچھ زائد عرصہ تک مجھے ظہیر احمد صدیقی مرحوم کی رفاقت کا شرف حاصل رہا ہے۔ اس طرح انکی شخصیت کے ان گنت پہلوؤں کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ عمر میں مجھ سے وہ چار پانچ سال بڑے تھے۔ اسلئے میں انکو ظہیر بھائی ہی کہتا تھا۔ علی گڑھ کے رشتہ سے بھی انکی عزت کرتا تھا۔ وہ بھی خاص شفقت اور بے تکلفی سے پیش آتے تھے۔ اکثر ایک ہی شعبہ سے وابستہ لوگوں میں کچھ چشمک یا رقابت سی ہوتی ہے۔ لیکن یہ بات میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ایسا کبھی محسوس نہیں ہوا۔ اور میرے انکے یا انکے اور شعبہ کے دوسرے اساتذہ کے درمیان ہمیشہ میں نے باہمی رواداری خلوص اور یگانگت کا ایک خوشگوار اور ہموار رشتہ محسوس کیا۔ اس میں انکی اخلاقی برتری اور تہذیبی تربیت کا حصہ شاید زیادہ تھا۔ یہی نہیں کوئی مشکل یا مسئلہ پیش آنے پر ہمیشہ تعاون کرتے۔ خلوص سے مدد کے لئے ہاتھ بڑھاتے۔ وہ شعبہ کے صدر ہوئے تو میں نے بھی شعبہ کے کاموں میں کھلے دل سے انکے ساتھ تعاون کیا۔ بعض موقعوں پر میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ بظاہر سیدھے سادے ظہیر بھائی بعض بے پروا اور بگڑے دل

رفقائے کار سے بھی کام لینے کا ہنر جانتے تھے۔

ظہیر بھائی کی اخلاقی خوبیوں کی ایک لمبی فہرست ہے۔ انکا گنانا ضروری نہیں۔ تاہم اتنا ضرور کہونگا کہ انکا کردار ظاہرداری، نمایشی اخلاق منافقت اور ریاکاری سے تقریباً پاک تھا۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ مستحق غریبوں مسکین اور غریب طلبا کی مدد کرتے تھے لیکن اس طرح کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ انکی پوشیدہ دادودہش کا ایک واقعہ ضرور بیان کرونگا۔ میں عرصہ تک دہلی کی ہند سوویت کلچرل سوسائٹی ISCUS کا نائب صدر رہا۔ اس کا دفتر کناٹ پلیس کے پہلو میں واقع ہے۔ ہم لوگوں نے فلسطینیوں کی تحریک کے لئے عطیات جمع کرنے کا اعلان کیا تھا۔ ایک بار میں عطیہ دینے والوں کی فہرست پر نظر ڈال رہا تھا تو اچانک ظہیر احمد صدیقی کے نام پر نظر پڑی۔ اب صحیح یاد نہیں لیکن نام کے آگے کئی ہزار روپے کی رقم کا عطیہ درج تھا۔ پتہ بھی انکا ہی نکلا۔ میں نے بہت دنوں بعد انکے اس کار خیر کا ذکر کیا تو مسکرا کر رہ گئے۔ اسی طرح کے اور بھی متعدد واقعات میرے علم میں ہیں۔

ایک استاد کی حیثیت سے ظہیر بھائی کو میں نے ہمیشہ ایک ماڈل مانا ہے۔ دوسرے اساتذہ کلاس لیں یا نہ لیں لیکن انکا وقت پر آنا اور گھنٹہ بجتے ہی کلاس میں پہنچ کر آخر تک کلاس لینا ایک طے شدہ واقعہ تھا۔ ایک بار میں نے پوچھا گھنٹہ بجتے ہی آپ اٹھ کر کلاس لینے کیوں بھاگتے ہیں؟ کہنے لگے دیر سے پہنچنے پر اکثر اگر سب نہیں تو دو تین طلبا ضرور بھاگ جاتے ہیں۔ اسلئے میں عجلت کرتا ہوں۔ وہ صرف ایسے مضامین اور ایسے متن پڑھانے پر اصرار کرتے تھے جن پر انہیں پوری قدرت ہوتی تھی۔ خصوصاً کلاسکی شاعری، مثنویاں قصائد انکا خاص میدان تھے۔ کلاس میں متن کی تدریس اور تشریح پر بھی وہ بہت زور دیتے تھے۔ اور یہ ایسا پہلو ہے جسے دوسرے اساتذہ نظر انداز کرتے تھے۔ انکی نگرانی میں جو طلبا پی ایچ ڈی کرتے تھے انکی مدد اور مشورہ کے لئے وہ ہمیشہ تیار رہتے

۲۰۔استاذی ظہیر احمد صدیقی سے میری پہلی ملاقات	ڈاکٹر مظہر احمدؔ	۱۳۵
۲۱۔ پروفیسر ظہیر احمدؔ صدیقی بہ حیثیت شاعر	ڈاکٹر توقیر احمدؔ خان	۱۴۰
۲۲۔ پروفیسر ظہیر احمد صدیقی کی یاد میں	تسلیم غوری بدایونی	۱۴۷
۲۳۔ میرا بچپن کا ساتھی ظہیر	رفیع الزماں زبیری	۱۵۴
۲۴۔ظہیر احمد صدیقی..... کچھ یادیں کچھ باتیں	ڈاکٹر اسلم فرخی	۱۶۲
۲۵۔ظہیر۔ میرا دوست	پروفیسر عشرت حسین فاروقی	۱۷۴
۲۶۔ظہیر بھائی	سعید احمد صدیقی	۱۸۰
۲۷۔ظہیر بھائی	سہیل احمد صدیقی	۱۸۶
۲۸۔میرے ابو	غزالہ خالد	۱۹۰
۲۹۔اونانا	بشریٰ خالد ہاشمی	۱۹۳
۳۰۔میرے نانا	فراز ہاشمی	۱۹۶
۳۱۔چھوٹے دادا	سمن انیس	۱۹۹

تعارف وتبصرہ

۱۔شرح قصائد مومن تعارف وتبصرہ	پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم	۲۰۵
۲۔مومن شخصیت اور فن۔مقدمہ	پروفیسر ڈاکٹر خواجہ احمدؔ فاروقی	۲۰۷
۳۔جذبات رضی مرتبہ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی	احسان دانش	۲۰۹
۴۔دیوان درد مرتبہ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی	احسان دانش	۲۱۰
۵۔کلیات فانی مرتبہ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی	سلیمان اطہر جاوید	۲۱۲
۶۔فانی کی شاعری از ڈاکٹر ظہیر احمدؔ صدیقی	سعادت علی صدیقی	۲۱۴
۷۔چند توصیفی و تاریخی قطعات		۲۱۷
۸۔ انتخاب غزلیات ومنظومات		۲۲۵
۹۔کوائف۔مراتب ومناصب		۲۳۷

تھے۔ دیکھا یہ گیا ہے کہ دوسرے اساتذہ اپنے مشاغل اور مصروفیات کو ترجیح دیتے تھے لیکن ظہیر بھائی کی اولین ترجیح طلبا اور انکے مسائل تھے۔

ظہیر احمد صدیقی مرحوم کی ادبی سرگرمیوں سے میرا پہلا تعارف ۱۹۵۵ء میں اس وقت ہوا جب میں ایم اے کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا اور ایک دوست کے ذریعہ علی گڑھ میگزین کا طنز و ظرافت نمبر میرے ہاتھ لگا۔ اس کے اڈیٹر ظہیر صاحب ہی تھے۔ مجھے یاد ہے کہ اس معیاری مجلّے میں طنز و مزاح پر رشید احمد صدیقی کے علاوہ کشن پرشاد کول سلطان حیدر جوش شوکت سبزواری اور قاضی عبدالودود جیسے اکابرین کے مضامین شامل تھے۔ بعد میں جب وہ دلّی کالج سے وابستہ ہوئے تو اسکے میگزین کا ایک خاص نمبر یعنی دلّی کا دبستان شاعری نمبر مرتب کر کے شائع کیا۔ یہ نمبر بھی دستاویزی حیثیت رکھتا ہے۔

پروفیسر ضیا احمد بدایونی کی ذات گرامی سے جہاں انہیں ذوق شعری اور ذوق علمی ملا وہاں مومن شناسی کا ذوق بھی انکے حصہ میں آیا۔ انہوں نے دہلی یونیورسٹی سے مومن خاں مومن کی حیات اور کارناموں پر جو تحقیقی مقالہ لکھا وہ تحقیق کے میدان میں ایک نمونہ کی حیثیت رکھتا ہے اور میں نے دیکھا کہ اکثر طلبا اسکو ایک مثال یا حوالہ کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ اسکے بعد مومن کے فارسی اور اردو کلام کے انتخابات اور شرحیں بھی شائع کیں لیکن اس سلسلہ کا انکا ایک گرانقدر کام 'دبستان مومن' ہے جو مومن کے تلامذہ کا ایک مستند تذکرہ ہے۔ وہ جو کہتے ہیں اگر پدر نتواند پسر تمام کند وہ ظہیر احمد صدیقی صاحب پر صادق آتا ہے۔ مومن کی شاعری اور انکی اعلیٰ خدمات کو متعارف کرانے میں اس خانوادہ نے بے مثال رول ادا کیا۔ مومن کے علاوہ خواجہ میر درد اور فانی کی شاعری کا تنقیدی محاکمہ بھی ظہیر صاحب نے بڑی بصیرت سے کیا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بات اہم ہے کہ تنقید ہو تعارف ہو یا شرح ظہیر احمد صدیقی صاحب مرحوم کبھی اپنے طلبا کی

ضرورتوں کو نظر انداز نہیں کرتے تھے۔ انکا افہام و تفہیم اور تنقید و تجزیہ کا انداز بے حد سلجھا ہوا شفاف اور واضح ہوتا تھا تا کہ طلبا انکی تحریروں سے بیش از بیش فائدہ اٹھا سکیں۔ جامعہ اردو علی گڑھ کے لئے بھی انہوں نے جو کتابیں مرتب کیں اور جو شامل نصاب ہوئیں ان میں بھی انہوں نے طلبا کی درسی ضرورتوں کا پورا لحاظ رکھا ہے۔ انکے علمی کاموں میں ذمہ داری احتیاط اور اعتدال کا احساس ہر جگہ نمایاں نظر آتا ہے۔

رفیق کار اور دوست کی حیثیت سے ظہیر بھائی کو میں نے ہمیشہ بہت مخلص خوش مذاق اور بے تکلف پایا۔ اپنے بارے میں نہ وہ کوئی مبالغہ آمیز رائے رکھتے تھے۔ نہ ہی کسی احساس کمتری کا شکار تھے۔ صدر شعبہ اور پروفیسر ہو کر بھی کبھی انکے رویے میں بے جا رعونت کا شائبہ نظر نہیں آیا۔ رفقائے کار سے یکساں برتاؤ کرتے۔ اگر کوئی کلاس پڑھانے میں کوتاہی کرتا تو نہایت مہذب اور نرم لہجہ میں اسے سمجھاتے اور ضروری ہوتا تو جونیر اساتذہ کو تنبیہ بھی کرتے۔

مذہب کی پابندی اور مذہبی حیثیت رکھنے کے باوجود ان میں بڑی رواداری اور دوسروں کے موقف کو خوش دلی کے ساتھ انگیز کرنے کی صلاحیت تھی۔ کوئی اہم مہمان آتا تو اکثر شعبہ کے اساتذہ کو بھی کھانے پر مدعو کر لیتے۔ مہمان نوازی میں وہ بڑے فراخ دل تھے۔ اسکے ساتھ ہی انکی حس مزاح بھی تیز تھی۔ اس کا بھرپور اظہار اس وقت ہوتا جب وہ شعبہ کے اساتذہ کے ساتھ سفر پر جاتے یا پھر اساتذہ اور طلبا کے ساتھ پکنک پر جاتے۔ چٹکلے لطیفے اور ظریفانہ واقعات دل کھول کر سناتے۔ بعض ادیبوں کے حوالے سے بھی مزاحیہ قصے سناتے لیکن اس کا خیال ہمیشہ رکھتے کہ کسی کا وقار مجروح نہ ہو اور کسی کی دل آزاری بھی نہ ہو اسی طرح انکے کچھ خاص دوستوں کا ایک Close Circle بھی تھا۔ سنا ہے وہاں وہ اور بھی کھل کھیلتے۔ اپنی علمیت کو بالائے طاق رکھ کر ہنسی دل لگی کی باتیں ہوتیں۔ پسندیدہ کھانے پکائے جاتے۔ اس طرح انکے اندر جو ایک یار باش اور باغ و

بہار انسان چھپا رہتا تھا وہ سامنے آجاتا۔ زندگی کی الجھنیں تناؤ اور تردد ات ہوا میں اڑ جاتے۔ یہ وہ لمحے ہوتے ہیں جب انسان اپنی شخصیت کے تمام فطری رنگوں کے ساتھ بے حجاب ہوتا ہے اور دوستوں کے دلوں میں یہی لمحے یادگار بن جاتے ہیں۔

☆☆☆

پروفیسر شمیم نکہت،
شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی۔

صدیقی صاحب

ڈپارٹمنٹ میں بار بار کانوں میں آواز پڑتی رہی ''صدیقی صاحب ریٹائر ہو گئے'' صدیقی صاحب ریٹائر ہو گئے۔ لیکن یقین جانئے اس طرف ہمارا دھیان بھی نہیں گیا۔ کہتے ہوں گے لوگ۔ صدیقی صاحب تو بس صدیقی صاحب ہیں۔ بہت ہوا تو ڈاکٹر صاحب کہدیا۔ بھلا ایسے لوگ کہیں ریٹائر ہوتے ہیں۔ ابھی کل ہی ہم نے ڈپارٹمنٹ میں دیکھا۔ صدیقی صاحب اسی پرانی ادا سے گردن ایک طرف کو تھوڑی سی جھکائے کمرے میں داخل ہوئے۔ سب کو سلام کرتے اور سب کے سلاموں کا جواب دیتے ہوئے سامنے والے صوفہ پر بیٹھ گئے۔ میرے ذہن میں ڈاکٹر عبدالحق کے الفاظ گونجے۔ کل آپ بھی چند جملے کہہ دیجئے گا۔ الوداعیہ پر۔ ایں الوداعیہ۔ کیسا الوداعیہ۔ اتنے اہم ڈپارٹمنٹ کے اہم ستون کا الوداعیہ ایک پوری تاریخ۔ جی ہاں پوری تاریخ جس کی ابتدا کرنے والے۔ آگے بڑھانے والے خواجہ احمد فاروقی تھے۔ اس تاریخ کے اس اہم ستون کا الوداعیہ نہیں۔ اور پھر میرے دل سے یقین کی گرد دھیرے دھیرے اڑنے لگی..... اتنی پیاری شخصیت اتنا مخلص نرم رو دوست..... کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ دیکھئے نا، سامنے مطمئن چہرے کے ساتھ بیٹھے ہیں۔ دیکھ لیجئے۔ اتنی خاکساری اور اتنی عظمت..... ڈپارٹمنٹ سے رخصت ہو رہے ہیں۔ اور چہرے پر اعتماد اور محبتوں کی اتنی

چمک..... تقریباً تیس سال سے ہم لوگ ایک خاندان کے فرد کی طرح مل جل کر خوشیاں اور غم بانٹتے رہے ہیں..... ہم لوگوں کے سامنے ڈپارٹمنٹ کے مسائل بھی آئے اور پالیسیاں بھی بنیں..... صدر شعبہ بدلتے بھی رہے..... لیکن ہر صدر نے ان کو جس اعتماد سے اپنا مددگار بنایا..... یہ ہمیشہ ایمانداری اور خلوص میں اس پر پورے اُترے۔ انکے سامنے سب سے اہم بات شعبہ کی عظمت رہی..... میں نے تو یہ محسوس کیا۔

مجھے یاد ہے..... میں نے پہلی بار جب ڈاکٹر صاحب کو دیکھا تھا..... تو وہ ہیڈ کی کرسی پر بیٹھے تھے..... میں پی ایچ ڈی کے مقالے کے سلسلے میں دہلی آئی تھی..... کئی صاحب علم حضرات کے دبدبے بھی دیکھے تھے..... دلی میں آئی تھی تھوڑا خوف تھا۔ ابھی دو ہی برس ہوئے تھے۔ ایم اے پاس کئے۔ خیر ہم صدر شعبہ سے ملنے کا خوف دل میں لئے کمرے میں داخل ہوئے..... لیکن یقین جانئے..... جس خوف کے ساتھ ہم نے کمرے میں قدم رکھا تھا۔ وہ تو کہیں باہر ہی بھٹک گیا تھا..... اندر تو سامنے بے حد مشفق..... مہربان چہرے والے..... سراپا شرافت ایک صاحب نظر آئے..... مجھے لگا میرے کوئی عزیز ہیں..... کالی شیروانی..... گلے تک بٹن بند..... سر پر ٹوپی..... سانولا سلونا رنگ..... ستواں ناک..... کشادہ پیشانی..... آنکھیں گہری تو ضرور تھیں..... لیکن کپٹ سے پاک..... شفاف جھیل کے مانند جھل جھل کر رہی تھیں..... یہ سب کچھ میں نے چند لمحوں میں محسوس کیا تھا..... پھر یاد نہیں کہ سوال میں نے زیادہ کئے تھے..... یا ڈاکٹر صاحب نے..... لیکن یہ ضرور یاد ہے کہ کمرے سے باہر آکر مجھے تعجب ضرور ہوا تھا یہ کیسا ہیڈ ہے؟..... ہیڈ تو لگتا ہی نہیں..... ہم نے سن رکھا تھا کہ دہلی شعبہ اردو کے ہیڈ فاروقی صاحب جب برآمدے سے گذرتے تھے تو دیواروں پر چیونٹیاں ساکت ہو جاتی تھیں اور اہم اسی ڈپارٹمنٹ کے ہیڈ سے مل کر نکلے تھے..... میں نے شارب کی طرف سوالیہ نگاہ ڈالی..... اور شارب نے فوراً کہا تھا ''نہایت شریف آدمی ہیں'' شارب کی کوئی بات آج تک سچ ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو لیکن یہ بات آج بھی اپنی پوری آب و تاب کے

ساتھ سچ ہے اور تازہ بھی۔

صدیقی صاحب اس قدر سادہ کردار کے انسان ہیں کہ وہ چاہے قیمتی سوٹ اور ٹائی میں ہوں..... شیروانی میں یا کرتے پاجامہ میں..... ان کی سادگی میں کوئی فرق نہیں آتا..... ورنہ لباس اور کرسی تو انسان کے تلفظ تک پر اثر انداز ہو جاتی ہے..... ڈاکٹر صاحب کی ٹائی چاہے فیشن میں ہو یا آؤٹ آف فیشن چاہے چوڑی ہو یا پتلی (غالباً ان کے پاس ٹائیاں بہت زیادہ ہیں) ان کو باندھ لینے سے مطلب..... انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا کہ رنگ میچ کرتا ہے یا نہیں..... ان کے ہاتھ میں چاہے ہلمٹ ہو یا کار کی چابی..... وہ بات ہمیشہ ''اردو'' میں کرتے ہیں..... دوسرے کی بات بے حد غور سے سنیں گے..... جس میں کانوں کے ساتھ آنکھ کا یوگ دان بہت اہم ہوتا..... پھر بہت آسان انداز میں سمجھائیں گے ''یہ بات اردو میں یوں ہے'' ان کے یہاں اردو کے معنی کچھ اور ہی ہیں۔ یعنی صاف اور سادی بات''۔ جس میں کوئی دھوکہ نہ ہو۔ اور غالباً اسی ''اردو'' کو انہوں نے اوڑھنا اور بچھونا بنالیا ہے۔ اسی نے انہیں ہر دلعزیز بنایا ہے۔ کہ دشمن بھی منھ کھولنے سے پہلے چپکے سے ادھر ادھر کنکھیوں سے دیکھ لیگا۔ کہ ان کے دوستوں کی تعداد افراط ہے۔ ہر عمر کے دوست ان کے ساتھ دیکھے جا سکتے ہیں۔ وجہ یہ کہ جسے ایک بار دوست مان لیا۔ سو مان لیا۔ اس مان لینے کی پاداش میں ان کو کبھی کبھی دکھ بھی جھیلنا پڑتا ہے۔ لیکن جو کبھی لبوں کو جنبش ہوئی ہو۔ ہاں ان کا ہونٹ بھینچ کر مسکرا دینا..... ان کے دکھ کی چغلی ضرور کھاتا ہے۔

آپ نے گھڑی کا پنڈولم تو ضرور دیکھا ہوگا..... بس ڈاکٹر صاحب کا وہی حال ہے..... اب آپ انہیں چاہے کچھ کہیں انکی صفتِ جوہر سیماب پر کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔ وہ ہر شب کے اندھیرے کو سحر کرنے پر تلے رہیں گے..... بلکہ کچھ دوستوں کو تو یہاں تک کہتے سنا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا ایک V.I.P. نئی دہلی ریلوے اسٹیشن پر اور ایک پرانی

دہلی ریلوے اسٹیشن پر تیار انتظار کرتا ہی رہتا ہے۔

ان کے سفر کے سلسلے میں بھابھی (بیگم افتخار صدیقی) نے بھی کئی بار بڑی سادگی سے ذکر کیا..... جس میں اکتاہٹ پوشیدہ تھی..... اب میں کیا بتاتی ان کو کہ یہ سب کیا دھرا انہیں کا ہے..... یہ پریکٹس ڈاکٹر صاحب کو اس زمانے میں ہوگئی تھی جب وہ غزالہ شہلا شیخو اور ٹیپو کو لے کر علی گڑھ میں رہنے لگی تھیں..... اور ڈاکٹر صاحب بچارے دہلی میں اکیلے۔

صبح صبح ڈاکٹر صاحب آنکھوں کو ملتے ہوئے تھکے تھکے ڈپارٹمنٹ پہنچتے..... اور نہ تھکے ہونے کا یقین دلاتے ہوئے بتاتے کہ کس طرح وہ دودھ والی گاڑی میں رات بھر آرام سے سوتے جاگتے صبح دہلی پہنچے ہیں..... برسوں کی اس پریکٹس کے بعد بھلا اب ان کو سفر سے کون روک سکتا ہے..... ویسے بھی حرکت تو زندگی کی نشاندہی کرتی ہے..... اور ڈاکٹر صاحب ماشاء اللہ عام لوگوں سے زیادہ ہی متحرک ہیں..... ہاں آپ کہیں اس سفر کی تگ ودو میں یہ نہ سمجھ لیجئے گا کہ ان کی علمی پیاس کہیں مجروح ہوئی ہوگی..... نہیں جناب ایسا ہرگز نہیں ہے۔ لکھ تو لے کوئی اتنے مقالے..... کرتو لے کوئی اتنی تقریریں..... اور پھر سارے ہندوستان کی یونیورسٹیوں کے کتنے ہی شعبوں کے وہ Active ممبر بھی ہیں..... یہ سب نبھانے کے باوجود کبھی بھی تھکن کا نام زبان پر آجائے..... ان سے ذرا پوچھئے..... یہ اتنے سیمنار..... میٹنگ، مشاعرے، امتحان یہ سب کیسے سنبھالتے ہیں..... تو فوراً مسکرا کر جواب دیں گے..... مقالہ کیا لکھنا ہے۔ بس غالب اور گوئٹے ہی تو کرنا ہے..... سو کر دیں گے..... اور جب مقالہ سنئے تو عش عش کر جایئے..... یہ راتوں رات کا بھید صرف ڈاکٹر صاحب کو ہی معلوم ہے..... کسی بحث میں حصہ لیں تو بغیر جوش وخروش بغیر کسی ایکٹنگ کے حاوی..... انکی مدھم لے سے نہ تو سامعین بچتے ہیں اور نہ قاری..... کہتے ہیں عالموں کے گھرانے کے نوکر چاکر بھی جب گفتگو کرتے

ہیں تو مثالیں حافظ اور سعدی کی پیش کرتے ہیں..... اور ڈاکٹر صاحب تو خود اس گھرانے کے وارث ہیں..... بڑی سے بڑی آزمایش ہو یا معمولی بات..... وہ اپنے اللہ صاحب کو ضرور یاد رکھتے ہیں۔ اور اللہ صاحب ان کی ہمیشہ مدد بھی فرماتے ہیں..... یہ دوسری بات ہے کہ کبھی کبھی ان کو نہ چاہتے ہوئے کچھ ایسا کرنا پڑا..... جس کا افسوس آج بھی انہیں ضرور ہوگا۔ کیونکہ بے انصافی ان کے بس کی بات نہیں..... ان کے ساتھ بے انصافی ہوگی اگر ان کی بیاض کا ذکر نہ کیا جائے..... وہ بیاض جس پر نہ جانے کتنی شرطیں ہاری اور جیتی گئیں..... کہ بیاض ان کی جیب میں ہے یا نہیں ہے..... ایک زمانے میں اکثر شام کو خواجہ احمد فاروقی صاحب کے کولری لین والے گھر میں یہ محفلیں ہوتیں..... جس میں فاروقی صاحب اور مغیث الدین فریدی صاحب کے علاوہ اور بھی احباب شامل ہوتے..... بیاض نکلتی اور شعر و شاعری کی محفل گرم ہوتی..... ڈاکٹر صاحب بہت نہیں کہتے ہیں..... اس لئے اکثر اچھی غزلوں کو دہرانا پڑتا ہے اور ان کے دوستوں کو ان کے اشعار یاد ہو جاتے ہیں مثلاً

میرے گھر میں دھوپ خوشی کی آئے بھلا تو کیونکر آئے
میرے گھر کا آنگن چھوٹا، دریچے دیوار بلند

اب ان کے گھر میں دھوپ آئے نہ آئے..... آنگن چھوٹا ہو یا بڑا..... ذرا نیچے دروں سے جھانک کر دیکھئے..... گھر ہے یا مہمان خانہ..... یا یوں کہئے پردیسیوں کی جائے پناہ..... نہ صوبے کی قید ہے..... نہ رشتے کی..... نہ چھوٹے کی نہ بڑے کی کوئی..... پی ایچ ڈی کا زبانی امتحان لینے آیا ہے تو کوئی ایم فل کا..... کوئی میٹنگ میں آیا ہے..... تو کوئی خریداری کرنے کسی کو علاج کرانا ہے..... تو کوئی اپنے بچوں کا رشتہ طے کرنے آیا ہے..... کسی کو اندرا گاندھی ایرپورٹ جانا ہے..... اور غضب تو کبھی یہ ہوتا کہ ڈاکٹر صاحب کو ڈرائیوری کا کام بھی انجام دینا پڑتا..... اب ان کے سارے بچے ایک ہی

کمرے میں سمٹ جائیں ..... ڈاکٹر صاحب کے گھر کی چہل پہل میں کوئی کمی نہیں آئیگی..... بلکہ کونے کونے میں برکت ہی نظر آئیگی۔

غضب تو یہ ہے ..... بلکہ شکر ہی ادا کرنا چاہئے کہ بھابھی یہ سب جھیل لیتی ہیں۔ چاہے بیمار ہوں..... کالج جانا ہو..... یا بچوں کی دیکھ بھال مع ڈاکٹر صاحب کے کرنا ہو..... پھر اللہ رسُول بھی کرتی ہیں..... کوئی نماز جو چھوٹ جائے..... اور ان سب سے بڑھ چڑھ کر اچھی شاعری بھی کرتی ہیں..... اور جو کبھی ماتھے پر شکن آجائے..... یا کوئی برتن زور سے کھڑک جائے..... یہ بھی ایک طرح سے اللہ صاحب کا ہی کرم ہے .....اُن پر۔

بات ادھوری رہ جائیگی اگر ڈاکٹر صاحب کے ایک شوق پر روشنی نہ ڈالی جائے۔ ''دعوت کا شوق'' چاہے دعوت کھلائیے یا کھائیے..... وہ دونوں طرح راضی..... کوئی بہانہ چاہئے ان کے یہاں دعوت تیار..... فریدی صاحب نے اسی شوق کے بارے میں ایک موقع پر کہا تھا ؎

ایک دعوت تھی دو دفعہ کھائی
آفریں بر ظہیر و قدوائی

مومن کے عاشق، فانی کے شیدائی، میر درد کے معتقد اور فیض کے رقیب۔ ان سب کے بارے میں تو آپ نے بھی ان کے قلم کا جادو دیکھا ہوگا۔ ''سنجیدہ مصنف'' یہی ہے نا آپ کی رائے لیکن اگر آپ کو ان کی بے تکلف صحبتوں کا فیض حاصل ہوا ہوتا تو آپ بھی ہمارے رائے سے ضرور اتفاق کرتے..... کہ خدا نہ کرے اگر ڈاکٹر صاحب نقاد اور شاعر نہ ہوتے تو بہت اچھے مزاح نگار ہوتے.....

میں خود پریشان ہوں اتنی بہت سی باتوں کو کس الوداعیہ جملے سے الوداع کہوں..... اور کس دل سے مان لوں کہ ڈاکٹر صاحب ریٹائر ہو گئے۔ میرا قلم یہ لکھنے پر

تیار نہیں کہ اب ہر روز ڈاکٹر صاحب میرے سلام کا جواب خیریت پوچھتے ہوئے مسکرا کر نہیں دیں گے.....خیر۔

اللہ ان کی عمر میں برکت دے.....قلم میں زور.....ہم کو دور سے بھی انکی رہنمائی.....انکی شفقت.....ان کی محبت منظور.....دعاؤں کے ساتھ۔

☆☆☆

پیش لفظ

اس کتاب کی اشاعت کا محرک دو باتیں خصوصیت کے ساتھ ہوئی ہیں جن کا اعتراف ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ایک تو یہ کہ یہ میرے اوپر ایک ایسا قرض تھا جس کو ادا کرنا اپنے سکون قلب کے لیے لازمی ہو گیا تھا دوسرے میری نظر میں ظہیر کی شخصیت کے بہت سے پہلو ایک ورثہ ہیں جس کو اپنی آنے والی نسلوں تک بہ حفاظت پہنچانا مجھے اپنا فرض محسوس ہو رہا تھا میں نے خود ان کی شخصیت کے بارے میں کچھ لکھنے کی کوشش نہیں کی کیوں کہ میرے بیانات کو ''سخن فہمی'' کی جگہ طرفداری'' خیال کیا جا سکتا تھا اس لیے میں نے ع

زبان خلق کو نقارہ خدا سمجھو

کے مقولہ پر عمل پیرا ہوتے ہوئے ان کے بارے میں کچھ مضامین پیش کر دئے ہیں۔

میں محترم سید حامد صاحب کی تہہ دل سے مشکور ہوں کہ جب وہ تعزیت کے لئے علی گڑھ تشریف لائے تو ان کی شفقت اور ہمت افزائی میرے اور میرے بچوں کے لئے بڑا سہارا بنی اور ان کا یہ مشورہ کہ آپ کو اللہ نے بہت صلاحیت دی ہے اس کو بیکار نہ ہونے دیجئے اور لکھنے لکھانے کا سلسلہ جاری رکھئے'' میرے لئے مشعل ہدایت بن گیا اور میں نے کچھ سال سے چھوٹے ہوئے اس مشغلہ کو پھر سے شروع کرنے کا تہیہ بلکہ کر لیا۔

آخر میں اپنے عزیز بیٹے طارق کے لئے بھی دعا گو ہوں کہ اس کی محنت ہر قدم پر میرے ساتھ رہی ورنہ ٹائپنگ اور پبلشنگ کی بھاگ دوڑ میرے بس کی نہیں تھی نیز

پروفیسر عبدالحق،
شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی۔

ڈاکٹر ظہیر احمد صدّیقی

برصغیر کے بعض علاقوں کی تاریخ شاندار روایات کی حامل ہے۔ بدایوں کی بھی ایک قدیم روایت ہے جس میں علم وفضل، درس وفکر، اصلاح وذکر کے انمول نمونے ملتے ہیں۔ یوں بھی یہ علاقہ بار بار مستفیض ہوتا رہا ہے مشرق سے آنے والے ذکر وفکر کے روحانی قافلے بارہا یہاں سے گزرے ہیں اور اپنے دیرپا نقوش چھوڑ گئے قطب الدین ایبک کی حکومت کے قیام سے پہلے یہاں فرزندانِ توحید کا کارواں دجلہ وفرات کی موجوں سے سیراب ہوکر گنگ وجمن کے کنارے مشرق کی روحانی تربیت میں مصروف تھا۔ انہیں کے دنوں کی تپش اور شبوں کا گداز تھا جس نے اس خطۂ زمین کو دیدۂ انجم میں رشک آسمان بنا دیا، کچھ ہی وقفہ کے بعد اس سرزمین سے بلند مرتبہ شخصیتیں پیدا ہوئیں۔ حضرت نظام الدین اولیاء کی پیدائش کا شرف بدایوں کو ہی حاصل ہے۔ ان کے مرید خاص امیر حسن سنجری بھی یہیں کے تھے۔ حسن صغانی بھی یہیں کے تربیت یافتہ ہیں۔ اگرچہ وہ لاہوری کہلائے امیر خسرو کے استاد شہاب الدین مہمرہ بھی اسی خاک سے اٹھے۔ اکبر اعظم کی سلطنت کے بے باک مجاہد ومورخ ملا عبدالقادر بدایونی کی نسبت سے یہ نام تاریخ کے اوراق میں انمٹ ہے۔

بدایوں شعروادب کا بھی گہوارہ رہا ہے محفل سماع کے ساتھ ساتھ بزم شعروسخن

بھی ہمیشہ آراستہ رہی ہے۔ظہور اللہ نوا، ضیاء الدین بخشی، مولانا فضل رسول مست، محشر، بے خود، نحو، مذاق، فانی، رضی، قمر کے ساتھ ساتھ یہ سلسلہ ہنوز پوری آب وتاب کے ساتھ باقی ہے۔ضیاء احمد ضیا، آفتاب احمد جوہر، آل احمد سرور، ابواللیث صدیقی، شکیل احمد شکیل، (مرحوم) وغیرہ نے اس تہذیبی روایت کے تسلسل کو قائم رکھا ہے۔

آج بھی اس دیس میں عام ہے چشمِ غزال
اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دل نشیں

چشمِ غزال کی سادگی اور معصومیت، نگاہوں کی دلنوازی اور دلکشی کا بانکپن ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی کی ذات میں موجود ہے۔ان کی سیرت وشخصیت میں شان دار ماضی کی صالح روایات کا بھرپور عکس ملتا ہے۔انکا خاندان علم وادب کے باب میں ایک مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔کہتے ہیں کہ خاندان کا سلسلہ کئی واسطوں سے محمد بن ابوبکر صدیقؓ سے ملتا ہے۔شروع میں اس خاندان کے بزرگ سنبھل میں آباد تھے۔تقریباً ڈھائی سو سال قبل مولیٰنا وجیہہ الدین سنبھل کی سکونت ترک کر کے بدایوں میں مقیم ہوئے۔

ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی کی پیدائش ۱۹۲۹ء میں ہوئی انکی تربیت پروفیسر ضیاء احمد اور انکے چچا مولوی آفتاب احمد جوہر کے سایہ عاطفت میں ہوئی۔یہ اگلے وقتوں کے لوگ تھے اسی ماحول میں ظہیر صاحب کی تربیت ہوئی یہی صفات ان کی شخصیت میں بھی ملتی ہیں، اسکے علاوہ چونکہ ذہنی تربیت کا زمانہ علی گڑھ میں گزرا ہے۔اسی لئے علیگڑھ انکی سیرت کا دوسرا جزو ہے۔اور وہ علی گڑھ ہے جس کی تقدیس اور احترام میں پروفیسر رشید احمد صدیقی نے جذب وشوق سے بھرے ہوئے سرمستی وسرشاری کے گیت گائے ہیں۔ظہیر صاحب بھی علی گڑھ سے بے پناہ محبت رکھتے ہیں ع

مانند حرم پاک ہے تو میری نظر میں

میں نے بارہا دیکھا ہے کہ جب کبھی ان کی موجودگی میں علی گڑھ پر تنقید ہوئی انہوں نے پوری جذباتی وابستگی کے ساتھ علی گڑھ کے اقدار کی مدافعت ہی نہیں کی بلکہ اُسے بین الاقوامی وسیع پس منظر میں ایک بلند معیار بنا کر پیش کیا وہ معیار جو اعلیٰ بھی ہے اور محبوب بھی جسکی نظیر علی گڑھ کے عقیدت مندوں کے دلوں کے علاوہ اور کہیں نہیں ملتی۔ علی گڑھ سے ان کی عقیدت کا اظہار ان کی دو نظموں ''نذر علی گڑھ'' اور ''ڈاکٹر ضیاالدین کی تربت پر'' سے بھی ملتا ہے۔ اسی طرح ان کی نظم ''ساقی نامہ'' اگرچہ عالم آشوب قسم کی نظم ہے مگر اس کے دو بندوں میں ۱۹۶۵ء میں علی گڑھ پر جو مصیبت آئی اس کا ذکر بڑی دلسوزی سے کیا ہے۔

وہ علی گڑھ کی بعض مقدس ہستیوں سے بے حد متاثر ہیں۔ ان بزرگوں نے شعر و ادب کے ساتھ ساتھ مذہبی اور اخلاقی قدروں کو یقین اور عقیدے کی استواری بخشی۔ یہی وجہ ہے کہ انکی شخصیت بہت ہی متنوع وسیع اور ہمہ گیر ہے۔ کیسی ہی محفل ہو کیسا ہی حلقہ ہو اور کیسا ہی اجتماع ہو ان کی شخصیت کوئی اجنبیت محسوس نہیں کرتی۔

کہ شمع من بہ ہر بزمست روشن

بعض لوگ انہیں مختلف اور متضاد محفلوں میں دیکھ کر قلب و نظر کے فساد میں مبتلا ہوتے ہیں۔ غالباً ایسے لوگوں کو ظہیر صاحب کی شخصیت کے متنوع اور رنگا رنگ پہلوؤں کی مختلف جہتوں کا اندازہ نہیں۔ وہ کلاس میں شاعری اور وقت ضرورت فنی تنقید اور فارسی بھی پڑھاتے ہیں۔ غزلیں لکھتے اور سناتے ہیں۔ نظام الدین اولیاء کی محفل سماع میں شرکت کرتے ہیں اور پھول والوں کی سیر بھی دیکھتے ہیں۔ ترقی پسندوں کی نشستوں میں شرکت کے ساتھ ساتھ تبلیغی اجتماعات میں بھی پورے ذوق و شوق سے شامل ہوتے ہیں۔ علوم اسلامیہ کے مفکر مولانا ابوالحسن علی ندوی 'نزہت الخواطر' کے سلسلہ میں انکا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

انہوں نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ۱۹۵۳ء میں اردو میں اور ۱۹۵۹ء میں فارسی میں ایم اے کیا۔ دہلی یونیورسٹی نے ۱۹۶۲ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی۔ دورانِ تعلیم علی گڑھ انجمن اردوئے معلیٰ کے سکریٹری اور علی گڑھ میگزین کے ایڈیٹر بھی رہے۔ انہیں کی ادارت میں طنز و ظرافت نمبر شائع ہوا۔ ۱۹۵۴ء میں علی گڑھ میں عارضی لکچرر کی حیثیت سے کام کیا پھر دہلی کالج (دہلی یونیورسٹی) میں لکچرر کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ ۱۹۶۱ء سے شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی میں ریڈر کے منصب پر فائز ہیں۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کے قیام یورپ امریکہ کے زمانہ میں دو بار قائم مقام صدر کی حیثیت سے شعبۂ اردو کی سربراہی کر چکے ہیں پچھلے سال روس جانے کے لئے تیار تھے۔ معاملات بھی پچاس فی صد طے ہو چکے تھے۔ ۵۰ فی صد اسلئے کہ مہمان تیار تھا میزبان انہیں بلانے پر آمادہ نہ ہوسکا کیونکہ میزبان کو مہمان سے شکایت تھی۔

نہ بہ بادہ میل داری نہ بہ من نظر کشائی
عجب ایں کہ تو ندانی رہ ورسمِ آشنائی

۱۹۶۴ء میں مسلم یونیورسٹی کورٹ کے ممبر منتخب کئے گئے۔ ۱۹۶۸ء میں انجمن ترقی اردو شاخ دہلی کے نائب صدر منتخب ہوئے۔ ۱۹۶۹ء ان کی زندگی کا مہتم بالشان زمانہ ہے۔ اسی سال قدرت نے حج بیت اللہ اور زیارت حرم نبویؐ پر حاضری کا شرف بخشا جو بہ قول اقبال ع

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر

یہ ان کی زندگی کا سب سے بڑا اعزاز ہے اور کیوں نہ ہو یہ ان کی عظمت کی دلیل ہے۔ کسی شخص کی عظمت کا بہت بڑا دارومدار جلیل القدر ہستیوں کے تعلق پر مبنی ہوتا ہے اور ایسی ہستی جس کے بارے میں کہا گیا ہے۔

اسی ہستی سے عقیدت اور بے پناہ جذبہ محبت ان کی عظمت کی دلیل ہے طبیعت کا یہ ہی سوز و گداز تھا جو انہیں ادبیات کے منصفانہ پہلوؤں کے غائر مطالعہ کی طرف لے گیا۔ خواجہ میر درؔد کا فکر و فن اردو ادب میں ایک محور کی حیثیت رکھتا ہے۔ درؔد کے فکر و فن کی ترجمانی میں ظہیر صاحب کا نام سرِ فہرست ہے۔ آپ نے ''دیوانِ دردؔ'' کو جامع اور مبسوط مقدمہ کے ساتھ مرتب کیا جس کے ابتک کئی اڈیشن نکل چکے ہیں۔ درؔد شناسی کے بعد ان کا دوسرا بڑا علمی کارنامہ مومن شناسی ہے۔ جب تک اردو کے یہ دو بزرگ شاعر موجود رہیں گے ظہیر صاحب کا نام بھی باقی رہیگا۔ درؔد اور مومن کی متضاد شخصیتوں میں ظہیر صاحب نے مشترک قدروں کا بڑا خوبصورت امتزاج پیدا کیا ہے۔ اس امتزاج میں انکی شخصیت کا عکس ملتا ہے ''شرح انتخاب دیوانِ مومؔن'' ''شرح قصائد مومؔن'' کے علاوہ ''مومن حیات اور شاعری'' ان کی مایۂ ناز تصنیف ہے۔ یہ عنقریب منظرِ عام پر آرہی ہے ''انشائے مومؔن'' (فارسی خطوط) معہ اردو ترجمہ بھی جلد ہی شائع ہورہی ہے۔ مضامین کا مجموعہ ''فکری زاویئے'' اور غالب کے فارسی کلیات کا انتخاب معہ اردو ترجمہ زیرِ اشاعت ہے تحقیقی مطالعہ انیؔس، تحقیقی مطالعہ، حالؔی، مثنوی سحر البیان، مثنوی گلزارِ نسیم، اور جذبات رضی کو آپ نے ترتیب و تدوین سے آراستہ کیا ہے۔ آپ نے پچھلے سال فانؔی بدایونی پر ایک وقیع تصنیف پیش کی۔ فانؔی بدایونی سے ان کا وطنی اور فکری تعلق ہے فانؔی کے مزاج آشنا کی حیثیت سے انہوں نے فانی کے فکر و نظر کا بڑا اچھا تجزیہ کیا ہے۔

ان تصانیف کے بین السطور ظہیر صاحب کا تخلیقی مزاج بھی کارفرما ہے۔ ان کی شخصیت میں چھپا ہوا فنکارانہ تخلیقی جذبہ موجود ہے جس کا نہ وہ خود اعتراف کرتے ہیں اور نہ دوسروں پر ظاہر ہونے دیتے ہیں۔ یہ بھی انکسار ہے۔ وہ فن کے تقدس کے ساتھ ہی جذبۂ تخلیق کی صحت مندی کے قائل ہیں۔ ان کے فن میں سوزِ جگر، درد و داغ و آرزو کی

تڑپ ہے۔ شاعری و پیغام کی خوبصورت آمیزش ملتی ہے۔ اور آمیزش سے غزل کے آبگینہ کو ٹھیس نہیں پہونچتی۔

میرے گھر میں دھوپ خوشی کی آئے بھلا تو کیسے آئے
میرے گھر کا آنگن چھوٹا دریچے دیوار بلند

یہ شعران کے فن کی عظمت کا دیرپا نقش ہے۔ اس شعر کی مقبولیت حلقۂ شام و سحر سے نکل چکی ہے۔ مشاعروں میں ظہیر صاحب سے یہ غزل سنانے کی فرمائش ضرور کی جاتی ہے۔ شعر گوئی ان کا باضابطہ مشغلہ نہیں۔ تفریحاً شعر کہتے ہیں۔ ہرے رنگ کی ایک جیبی بیاض ہے جس میں چند غزلیں موجود ہیں۔ یہ بیاض تقریباً ہمیشہ موجود رہتی ہے۔ دو ایک بار اس بیاض کی موجودگی اور غیر موجودگی کے بارے میں احباب کے درمیان بازی لگ چکی ہے۔ کوئی ہارا کوئی جیتا۔ ظہیر صاحب بیاض ہمیشہ اسلئے رکھتے ہیں کہ انہیں غزلیں زبانی یاد نہیں رہتیں۔ اور مشاعروں کا کوئی ٹھیک نہیں کب ہو جائیں اس لئے ''احتیاط بڑی چیز ہے'' اُسی بیاض کے یہ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

چلے ہیں زیست کی راہوں میں روشنی کرنے
جو اپنے گھر کے اندھیرے نہ کر سکے روشن
ہماری دشت نوردی کی داد دے کوئی

بھری بہار میں چھوڑ آئے گھر کا گھر تنہا
فضا خموش، کلی دل گرفتہ، گل صد چاک
بتاؤ کیا یہ ہی رنگِ بہار ہوتا ہے
خزاں کا دور بھی جس کی ہنسی نہ چھین سکے
وہ گل امانتِ فصلِ بہار ہوتا ہے

ہمارے شعبہ کی یہ سب سے بڑی خصوصیت ہے کہ یہاں پر بہ یک وقت ایسی متنوع، رنگارنگ اور باصلاحیت شخصیتیں جمع ہوگئی ہیں جن کی مثالیں دوسری جگہ نہیں ملتیں۔ کچھ شخصیتیں ایسی ہیں کہ ان کے جلال و جبروت کے سامنے نگاہ نہیں ٹھہرتی۔ ان کی صلاحیتوں اور علم و فضل کا وقار اتنا بلند ہے کہ ان کے روبرو مشاہدہ وادراک کسبِ نور کی اجازت تو دیتے ہیں مگر لب کشائی کی نہیں۔ دوسری طرف ایسے لوگ بھی ہیں جن کی سادگی، بے پروائی اور قلندرانہ بے نیازی دامنِ دل کو بے تحاشا کھینچتی ہے یہ لوگ آلام دوگیتی کو غرق مئے ناب کر کے دامن کش ہو چکے ہیں۔ ان کی جلوت وخلوت، سوز وساز اور ناز و نیاز میں آب وگل کے فتنوں اور مکروہات دنیا سے بڑی بے نیازی ملتی ہے۔

ظہیر صاحب کے مزاج میں فطری سادگی ہے۔ اس سادگی میں بھولا پن اور معصومیت کا پہلو ضرورت سے زیادہ ہے۔ جسے بعض مکروہ طبیعتیں کچھ اور نام دیتی ہیں اور سادگی کی عزت و ناموس کو سرِ بازار رسوا کرتی ہیں ان کی شخصیت میں کوئی چھل کپٹ نہیں۔ انکی سادگی خلوص پر مبنی ہے۔ اسی خلوص کی وجہ سے وہ اہل زمانہ کے اندازِ قد کو پہچاننے میں خیر وشر کا امتیاز نہیں کرتے جس کی وجہ سے کبھی کبھی انہیں پرزد، پڑتی ہے۔ مگر یہی خلوص ان کو تکلیفوں کو گوارا کرنے کی بے پناہ قوت بھی دیتا ہے۔ ان کی سیرت میں ایک باغ و بہار شخصیت موجود ہے شاید اسی لئے وہ زندگی اور کائنات کے منفی اقدار اور طرزِ فکر کے منفی پہلوؤں کو خاطر میں نہیں لاتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ فانی کو قنوطی شاعر نہیں مانتے۔ غالبؔ کی طرح وہ ''برق سے شمع ماتم خانہ'' کو روشن کرتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ عنصر ان کے طرزِ فکر کی صلاحیت اور صحت مندی کی دلیل ہے۔

دوسری طرف انکی شخصیت کی خود فراموشی بھی قابل رشک ہے۔ وہ صرف خودی کی خلوتوں میں گم ہو کر سراغِ زندگی کے اسرار دریافت نہیں کرتے بلکہ ''عالمِ بے خودی کی

سرخوشی اور سرمستیوں کی شاہ راہوں پر بھی اپنے وجود کے ساتھ ساتھ دوسروں کے وجود کو بھی بھول جاتے ہیں۔

انکا حلقۂ احباب اور دائرہ محبوبیت بہت وسیع ہے۔ ہمارے اسلاف نے شخصیت کے قد وقامت کا جو معیار مقرر کیا ہے اس میں اس کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔ ہمارے شعبہ میں ظہیر صاحب کی بڑی ہر دلعزیز شخصیت ہے۔ بڑوں کا احترام اور چھوٹوں پر شفقت ان سے سیکھنے کی چیز ہے۔ اسی لئے بڑے بھی ان پر شفقت اور چھوٹے ان کا نیاز مندانہ احترام کرتے ہیں۔ وہ تین حیثیتوں سے متعارف ہیں۔ ڈاکٹر صدیقی، ظہیر صاحب اور ظہیر بھائی ظہیر بھائی کا حلقہ ''حلقۂ درویشاں'' ہے۔ وہ ایک شفیق استاد کی حیثیت سے بہت کامیاب ہیں۔

باغ و بہار طبیعت پانے کے باوجود وہ محدود معنوں میں کم گو بھی ہیں اور کم آمیز بھی۔ کم گو اسلئے کہ انہیں سود و سودا مکر و فن کی زبان نہیں آتی۔ اسی وجہ سے کم آمیز بھی ہیں۔ وہ سچے اور کھرے جذبات کو گفتار کے اسلوب کی پرواہ کئے بغیر ظاہر کرنے کے قائل ہیں۔ یہ بیباکی اور جرأتِ گفتار ان کے اندر ایک طرح کی ہمت پیدا کرتی ہے۔ اگرچہ وہ بڑے ہی نرم خو اور نرم جو واقع ہوئے ہیں۔ اور ان کی طبیعت میں بے پناہ انکسار ہے۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ نو وارد کو خفت ہوئی ہے اور ظہیر صاحب نے ایک انبساطی گداز محسوس کیا ہے۔ ان کے مزاج میں ایک زیر لب شوخی بھی ہے۔ اس کا اظہار ان کی گفتگو، لطیفوں اور انکے بنائے ہوئے اصطلاحی اشاروں اور علامتوں سے ہوتا ہے۔ کبھی کبھی وہ مات بھی کھا جاتے ہیں۔ ان اشارتی علامتوں کو سمجھنے کے لئے ان کے مزاج کے اس پس منظر کو سمجھنا ضروری ہے جس میں جلوت و خلوت، ظاہر و باطن کا کوئی فرق نہیں ہے۔ وہ ظاہر داری کے مطلق قائل نہیں ہیں۔ ظاہری آرائش سے بھی بے نیاز رہتے ہیں۔ بالوں کو صرف انگلیوں سے درست کر لیتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ ٹائی کی گرہ ٹھیک

ٹھاک ہو۔ اگر ٹائپسٹ نہیں تو وہ خود ٹائپ کریں گے۔ چپراسی نہیں ہے تو اس کا کام بھی کرنے میں تامل نہیں۔ دوسروں کے لئے ہمیشہ سینہ سپر رہتے ہیں۔ مکر و فریب کی اس دنیا میں ایسے افراد کا وجود اعلیٰ اقدار کی موجودگی کی دلیل نہیں تو اور کیا ہے؟ مختصراً انکی شخصیت اور سیرت دل کشی اور نظر افروزی کا ایک دل آویز پیکر ہے۔

اے گل بتو خرسندم تو بوئے کسے داری

☆☆☆

پروفیسر عبدالمغنی
پٹنہ یونیورسٹی

پروفیسر ظہیر احمد صدیقی بحیثیت انسان

ہندوستان کے جن ادیبوں اور معلموں کے ساتھ میرے دیرینہ تعلقات ہیں ان میں ایک نمایاں شخص پروفیسر ظہیر احمد صدیقی ہیں۔ وہ اکثر پٹنہ آتے رہتے ہیں اور میں دلی علی گڑھ وغیرہ جاتا رہتا ہوں، جہاں مختلف مواقع پر ہم دونوں کی ملاقاتیں اور باتیں ہوتی رہتی ہیں۔ ہم لوگ انجمن ترقی اردو ہند اور جامعہ اردو علی گڑھ جیسے تہذیبی اداروں کی مجالس عاملہ کے ارکان بھی ہیں، جنکے جلسوں میں ہماری یک جائی ہوتی ہے۔ بالعموم ان نشستوں میں متعدد مسائل پر جو غور و فکر ہوتا ہے اس میں صدیقی صاحب میرے ہم خیال ہوتے ہیں یا میں انکا ہم خیال ہوتا ہوں۔ مذکورہ اداروں کے انتخاب میں بھی ہمارے درمیان اتفاق و اتحاد ہوتا ہے۔ میرے اور صدیقی صاحب کے کئی دوست بھی مشترک ہیں، جن میں ایک نمایاں ترین نام ڈاکٹر خلیق انجم، جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند و نائب شیخ الجامعہ جامعہ اردو علی گڑھ ہے۔ بسا اوقات ہم تینوں نے، بعض دوسرے رفیقوں کے ساتھ مل کر، چند موضوعات پر متحدہ موقف اختیار کیا ہے اور درپیش مہمات سر کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔

ان سرگرمیوں میں صدیقی صاحب کو میں نے بہت قریب سے دیکھا اور ان

کمپیوٹر پر پورے مواد کی کمپوزنگ سیٹنگ اور ٹائٹل کور کی ڈیزائننگ وغیرہ بھی سب اسی کی محنت کا نتیجہ ہے۔ اگر اس کی آرٹسٹک اور مشکل پسند و باریک بیں کوششیں شامل نہ ہوتی تو شاید یہ کتاب اتنی جاذب نظر نہ ہوتی۔

ساتھ ہی میں ان مضمون نگار حضرات (جن میں ظہیر کے استاد بھی ہیں۔ دوست اور ساتھ بھی اور ان کے شاگرد بھی) کی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میری فرمائش کو شرف قبولیت بخشا اور اپنے مضامین عنایت کر کے اس کتاب کی اشاعت کا سبب بننے خاص طور پر میں فیروز صاحب کی ممنون ہوں جنھوں نے برابر اپنے مشوروں سے نوازا کئی اور لوگوں سے بھی میں نے درخواست کی مگر ان کی طرف سے یا تو جواب ہی نہیں ملا یا پھر جواب باصواب سے محروم رہی۔ یقیناً اس میں ان کی کوئی مجبوری رہی ہوگی۔ یہ بھی اعتراف کرلوں کہ میں نے صرف ان ہی لوگوں سے درخواست کی جن سے ظہیر کے بعد میرا رابطہ رہا اور جنھوں نے اس آزمائش کے وقت میں اپنی ہمدردی اور تسلی سے میری ہمت کو ٹوٹنے نہیں دیا۔ کچھ مضامین وہ بھی ہیں جو دہلی یونیورسٹی سے ریٹائرمنٹ کے موقعہ پر شعبہ کے ساتھیوں اور بعض دوسرے احباب نے لکھے تھے اور جنھیں ایک Souvenir کی شکل میں چھپوانے کا منصوبہ بنایا گیا تھا لیکن پھر یہ منصوبہ ہوا میں تحلیل ہو گیا تھا۔ شاید اس کی وجہ ظہیر کا دہلی سے مراجعت کر کے علی گڑھ آجانا رہا ہو کیونکہ۔ آنکھ اوٹ تو پہاڑ اوٹ

افتخار

پندرہ مئی 2004ء

کے طرزِ فکر نیز طرزِ عمل کو سمجھا ہے۔ موصوف کے طریق کار میں جو نکتہ بہت روشن نظر آیا ہے وہ ان کی مروت و شرافت ہے۔ وہ دوستوں کے دوست ہیں، گرچہ یہ کہنا مشکل معلوم ہوتا ہے کہ دشمنوں کے دشمن بھی ہیں۔ دراصل وہ ایک نرم خو، شائستہ و خلیق اور مرنجاں مرنج انسان ہیں۔ انکے مزاج میں سختی نہیں، وہ ستیز کے بجائے ساز کی طرف مایل ہیں اور ایک باہمہ فرد ہیں، جو بے ہمہ نہیں۔ وہ نہ کم آمیز ہیں نہ دیر پیوند، بلکہ بہت جلدی گھل مل کر بے تکلف ہو جانے والے۔ یہی وجہ ہے کہ دوستوں کے حلقے میں وہ مقبول ہیں، جب کہ دشمنوں کے حلقے میں شاید معصوم سمجھے جاتے ہوں۔ یہ ایک بے ضرر اور سادہ مزاج شخص کی پہچان ہے، گرچہ صدیقی صاحب کو بالکل سادہ لوح تصور کرنا صحیح نہیں ہوگا۔ وہ اپنے بھلے برے کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اور کسی قلندرانہ جرأت سے کبھی کام نہیں لیتے۔

صدیقی صاحب ایک ایسے دوست ہیں جن کے ساتھ وقت بہت اچھا گزر سکتا ہے۔ وہ نہ تو غیر ضروری باتیں کرتے ہیں نہ شور مچاتے ہیں۔ وہ کم سخن نہیں، لیکن شیریں سخن ضرور ہیں، دھیمے دھیمے، دل چسپ اور بعض وقت پُر مذاق باتیں کرنے والے۔ ایک خوبی یہ بھی ہے کہ پیٹھ پیچھے کسی کی برائی گویا نہیں کرتے اور کوئی بات بڑھ چڑھ کر کرنے کے بالکل عادی نہیں۔ دوستوں کے ساتھ معرکوں میں شریک رہتے اور اپنا رول بخوبی ادا کرتے ہیں، مگر مثل کلیم معرکہ آرا نہیں ہوتے، نہ ضرب لگاتے ہیں، نہ جنگِ دست بہ دست کرتے ہیں، بحث مباحثے میں بھی کم ہی پڑتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ صدیقی صاحب اپنے آپ کو سنبھال کر رکھتے ہیں، گرچہ لیے دیئے نہیں رہتے۔ وہ ایک کھلے دل کے ایک ایسے آدمی ہیں جو وضع دار بھی ہیں، دل دار بھی۔

☆☆☆

ظہیر احمد صدیقی میری نظر میں

ظہیر احمد صدیقی صاحب سے میری ملاقات سب سے پہلے غالباً ۱۹۶۴ء یا ۶۵ء میں جے پور میں منعقدہ اردو کانفرنس میں ہوئی،، جو انجمن ترقی اردو کی کانفرنس تھی اور جس کے مقامی روح رواں حضرت شاغل تھے۔ اس وقت ظہیر احمد صاحب نہایت دبلے پتلے مگر تیز گفتار آدمی تھے۔ ان کے بالوں کا ایک خاص انداز تھا جو ہر وقت ہوا میں اڑتے رہتے تھے۔ میں ظہیر احمد صاحب سے تو کم واقف تھا، مگر ان کے والد محترم سے بہت اچھی طرح واقف تھا۔ مومنؔ دہلوی پر ان کی تشریحات اور نگار لکھنو میں ان کے تاریخ اسلام اور اسلام کے دوسرے مسائل پر مضامین دیکھ چکا تھا۔ جس میں ان کے دلائل اور بحث کے توازن نے مجھے بے حد متاثر کیا تھا۔ ظہیر احمد صاحب سے مل کر اس لئے بھی خوشی ہوئی کہ وہ انہیں ضیاء احمد بدایونی صاحب کے بیٹے ہیں جن کی تحریریں میں بڑے شوق سے پڑھتا تھا۔ ہم لوگوں میں اس وقت علم و ادب سے زیادہ ہونے والی کانفرنس اور پھر جے پور شہر کی خوبصورتی اور وہاں کی تفرج گاہوں علی الخصوص، پرانے جے پور کی عمارات اور راجپوتوں کی تہذیب پر باتیں ہوئیں۔ اس کانفرنس میں اردو کے بہت سے مشاہیر شامل تھے۔ کچھ سے میں پہلے سے واقف تھا اور کچھ سے ہم لوگوں نے مل جل کر واقفیت حاصل کی۔ ان مشاہیر میں سید سجاد ظہیر احتشام حسین، پروفیسر مسعود حسن

رضوی، پروفیسر عبدالقادر سروری،، آل احمد سرور، حیدرآباد کے پروفیسر فضل الرحمان، سری نواس لاہوٹی اور بہت سے لوگ تھے۔ بہار کا جتھا سب سے بڑا تھا جس کی سربراہی ڈاکٹر غلام سرور ایڈیٹر سنگم کر رہے تھے۔ ظہیر احمد صاحب بھی میری ہی طرح کم آمیز آدمی ہیں مگر آدم بیزار نہیں۔ اس لئے ہم لوگ بے سبب سب سے ہلو ہلو تو نہیں کرتے تھے مگر اپنے بزرگوں سے حفظ مراتب کا لحاظ کر کے ملتے رہے کہ بہر حال یہ لوگ ہمارے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ تھے۔ جن میں کچھ لوگ لیجنڈ (Legend) کی حیثیت رکھتے تھے۔

کانفرنس کے بعد پھر مدتوں ظہیر احمد صاحب سے ملاقات نہ ہوئی مگر ان کے خطوط اور ان کی کتابوں کے تحفے مجھ تک پہنچتے رہے۔ اس وقت میر انیس پر ان کی ایک مختصر کتاب چھپی جو میر انیس کی شاعری اور حیات پر ایک نئے ڈھنگ کا احصا تھی۔ پھر اور بھی چھوٹی چھوٹی کتابیں جن میں دیا شنکر نسیم کی گلزار نسیم اور مثنوی سحر البیان تھیں پھر مومن پر ان کی کتاب ملی جس میں ان کے نقد و نظر کے جوہر کھلے۔

۱۹۷۷ء میں جب مجھے دلّی یونیورسٹی میں وزٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے کچھ دنوں تک درس و تدریس کا موقع ملا تو ظہیر احمد صدیقی کو مزید، قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ظہیر صاحب ایک پرخلوص دوست اور مرنجاں مرنج قسم کے آدمی تھے۔ خلوص ایسا کہ انھوں نے اپنا اہم اور محبوب پرچہ، اقبال بھی مجھے پڑھانے کے لئے دے دیا کہ انہیں میری اقبال سے دلچسپیاں معلوم تھیں۔ جو لوگ یونیورسٹیوں کے مزاج سے واقف نہیں، وہ اس ''قربانی'' کی اہمیت کو نہیں سمجھ سکتے۔ یونیورسٹیوں میں عموماً، لوگ، اپنا پرچہ اور اس کی تعلیم و تعلّم کو اپنی مہارت اور ممارست کا ثبوت سمجھتے ہیں اور کسی دوسرے کو تو کیا اپنے قریب ترین دوستوں کو بھی پڑھانے کے لئے نہیں دیتے اور پھر جس کے متعلق معلوم ہو کہ اسے بھی اس خاص موضوع سے دلچسپی ہے تو اسے تو کبھی بھی اس کی اجازت نہیں دیتے کہ وہ اس پرچے کو پڑھائے اس کے بہت سے اسباب ہوا کرتے ہیں۔ مگر ظہیر

صاحب نے بڑی محبت سے مجھے اقبال پڑھانے کے لئے دے دیا تھا یہ ان کی عین عنایت تھی اور یہی نہیں بلکہ کبھی کبھی میرے کلاس میں آ کر طالب علموں کی صفوں میں بھی بیٹھ جاتے امتحان کے لئے نہیں بلکہ اپنی دلچسپی کے لئے پھر شعبے کے باہر بھی ان سے ادبی جلسوں اور سیمناروں میں برابر ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ اسی درمیان ،، ماہِ رمضان آ گیا۔ اس وقت ظہیر صاحب تیمار پور میں رہتے تھے۔ اکثر شام کو ان کے یہاں افطار کا انتظام ہوتا۔ میں مال روڈ پر، بس سے اتر پڑتا اور ظہیر صاحب مجھے مال روڈ سے اپنے اسکوٹر پر بٹھا کر اپنے گھر لے جایا کرتے۔ دلّی شہر کا ایک مزاج یہ بھی ہے کہ کوئی وہاں، کسی کو نہ تو اسٹیشن رخصت کرنے کے لئے جاتا ہے اور نہ ہی لینے کے لئے۔ شاید طویل فاصلے مانع آتے ہیں مگر ظہیر صاحب اکثر مجھے اسٹیشن پہنچانے آتے۔ شعبے میں بھی شاید ہی کبھی کسی سے ان کی سخت کلامی ہوئی ہو کہ وہ صلح کل کے آدمی تھے۔ جہاں تک ہو سکتا اپنے ساتھیوں کو مدد پہنچانے کی فکر کرتے۔ ان کے یہاں بے تکلفی میں بھی درجے بندیاں تھیں۔ بس ہر آدمی کے ساتھ وہ اسی حد تک بے تکلف ہوتے، جہاں تک ان کا اپنا رکھ رکھاؤ بھی باقی رہے وہ علی گڑھ کے طالب علم رہے ہیں ان کا بچپن بھی علی گڑھ میں گزرا، مگر ان میں نہ اتراہٹ ہے اور نہ بے جا تفاخر اور نہ ہمچو من دیگرے نیست، والا مزاج۔ شاید یہ ان کے والد محترم کی تربیت ہی کا اثر ہو سکتا ہے۔ ان کے والد محترم اپنے مذہبی عقائد میں بے حد متوازن تھے اور اسلامیات پر، ان کی بڑی اچھی گرفت تھی۔ ظہیر احمد صدیقی کی مذہبیات سے وہ دلچسپی تو نہیں اور جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں، تاریخ اسلام پر ان کی وہ گرفت بھی نہیں مگر مذہب کے معاملے میں نہ وہ بے راہ رو کبھی رہے نہ متعصب نہ متشدد۔ وہ ایک طرح کے صوفی منش آدمی کے مانند مذہب کی اختلافی باتوں میں پڑنے سے گریز کرتے تھے۔

ظہیر احمد صدیقی، ادبی نظریات میں، کلاسکی مزاج رکھتے تھے۔ انہیں نئے ادب سے نہ زیادہ دلچسپی تھی اور نہ وہ کبھی نئے ادب پر زیادہ باتیں کرتے، نہ اپنی تحریروں

میں نئے ادب کو بہت زیادہ زیر بحث لاتے، مگر ایسا نہیں کہ وہ نئے ادب سے بے خبر ہوں۔ مگر ان کا اصل ادبی مزاج خالص کلاسکی ہے۔ اپنے والد محترم کی طرح ظہیر صاحب بھی مومنؔ کے ایک طرح سے فین ہیں، مومنؔ اور ان کے دور کو سمجھنے اور سمجھانے کے پیمانے بھی مشرقی تنقید کے پیمانے ہیں اور وہ اپنی تنقید کو زیادہ تر مشرقی انداز نظر ہی سے لے کر چلتے ہیں۔ اگرچہ انھوں نے اپنے تنقیدی مضامین کے مجموعے، جدید شاعری میں فیضؔ، فراقؔ، جذبیؔ، جاں نثار اخترؔ، مجروحؔ، سب پر باتیں کی ہیں مگر ان کی تنقید کے پیمانے نئی تنقید یا نئے طور طریقوں سے نہیں آئے ہیں۔ پھر انھوں نے جدید شعرا کے لیے محاسبہ کا اپنا ایک نظریہ رکھا ہے۔ ظہیر صاحب دوسرے نقادوں کے نکالے ہوئے نتائج سے متاثر نہیں ہوتے۔ ان کے استخراج نتائج کا انداز ان کا اپنا تھا خواہ کوئی اس سے اتفاق کرے یا نہ کرے۔ کون کیا کس کے لئے کہتا ہے وہ اس کی پروا نہیں کرتے، بلکہ اپنے مطالعے کی روشنی میں نتائج نکالتے ہیں۔ چنانچہ فیضؔ کے متعلق لکھتے ہیں۔

''ان کے تازہ ترکلام سے مجھے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اب ان کے شاعرانہ وجدان کے سرچشمے خشک ہو چکے ہیں۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ اپنے دو بزرگ ہم عصروں (جوشؔ و فراقؔ) کی طرح، ان کی شاعری کا چراغ بھی گل ہونے کے قریب ہے۔ ممکن ہے کہ فیضؔ کے کچھ ناقد اس پر مصر ہوں مگر میں اس حد تک جانے کو تیار نہیں''۔

(جدید شاعری ص ۳۷ پہلا ایڈیشن)

جاں نثار اختر کے متعلق لکھتے ہیں۔

''ترقی پسند تحریک کے عروج کے عہد میں جن لوگوں نے اپنے آپ کو اس کے سیلاب سے محفوظ رکھا، ان میں جذبیؔ اور جاں نثار اخترؔ کا نام لیا جا سکتا ہے۔ جاں نثار اخترؔ، اس دور میں ہمارے مشرقی اقدار کے امین ہیں۔''

(جدید شاعری ص ۱۰۶)

اب کوئی اس سے اتفاق کرے یا نہ کرے، ظہیر صاحب ان دونوں شعرا کے کلام سے اسی نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ دونوں حضرات ترقی پسند نہیں ہیں اور اسی پوائنٹ کو لے کر ظہیر صاحب نے جذبی اور جان نثار اختر کے کلام پر بحث بھی کی ہے۔ جو بے حد دلچسپ ہے، وہ ترقی پسند تحریک کو معقول اور مناسب ادبی تحریک نہیں مانتے کہ اس کا انحصار خالص پروپیگنڈے پر ہے۔ اوپر کی تحریر میں ''سیلاب'' لفظ کا استعمال بھی ان کی اس تحریک سے ناپسندیدگی کو ظاہر کرتا ہے۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ پریم چند کو ترقی پسندی سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور نہ ہی وہ ترقی پسند تھے۔ ''پریم چند کی افسانہ نگاری۔۔ ایک محاکمہ'' مشمولہ ''میزان قدر'' میں ان کی بحث انہیں خطوط پر ملتی ہے۔ ان کے خیال میں پریم چند محض ایک نئی ادبی تحریک دیکھ کر اس کی طرف صرف متوجہ ہو گئے تھے۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے۔

''دراصل صورت حال یہ تھی کہ ترقی پسند تحریک کے آغاز میں پریم چند نے جن مصلحتوں کی خاطر، ان لوگوں کا ہم سفر بننا گوارا کیا تھا، اس کے اسباب صرف اس قدر تھے کہ ترقی پسند تحریک کے آغاز میں ایک نئی چیز کے اشتیاق میں مختلف الخیال لوگ جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ ان میں نئی نسل کے نمائندوں کے ساتھ جوش جیسا جاگیردارانہ مزاج کا انسان بھی تھا اور پریم چند جیسا کلاسکیت پسند شخص بھی تھا۔''

(میزان قدر ص ۱۷۳)

''بعض لوگ پریم چند کو انقلابی ادیب کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو پریم چند سے عقیدت کی رو میں بھول جاتے ہیں کہ پریم چند ایک مصلح تو ہیں مگر انقلاب نہ ان کا مقصد تھا اور نہ ان کا عمل، اس مقصد کا تابع تھا۔ انقلاب جس تیز روی کا مطالبہ کرتا ہے، وہ پریم چند کے یہاں نہیں۔'' (میزان قدر ص ۱۶۷)

زندگی کا جتنا تجربہ پریم چند کو تھا، کسی ادیب کو شاید ہی رہا ہو۔ مگر ظہیر احمد صدیقی

صاحب اس خیال سے اتفاق نہیں کرتے اپنے اسی مضمون میں جس کا تذکرہ اوپر کیا گیا ہے، وہ لکھتے ہیں۔

''تیسری نمایاں کمزوری ان کے سماجی نقطہ نظر اور سماجی بصیرت Vision کی ہے یہ ان کی ذاتی حدود (ذات پات کی بندشیں عقائد و رسوم کی گرفت، ماحول اور تربیت کے اثرات اور ان کے سیاسی و سماجی نظریات کی حدود ہیں) پریم چند سماجی امراض کا نسخہ پیش کرنا تو درکنار صحیح تشخیص سے بھی قاصر رہتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ ان کا تجزیہ سطحی اور غیر حقیقی ہوتا ہے۔

مجھے معلوم نہیں کہ ظہیر صاحب نے پریم چند کا کتنا مطالعہ کیا ہے اور ان کی تحریر اور نقاط نظر کے کتنے پہلو ان کی نظر میں ہیں، مگر پریم چند کے سلسلے میں ان کی یہ رائے درست نہیں کہ پریم چند ہندوستانی سماج کی نبض اچھی طرح پہچانتے نہ تھے حقیقت یہ ہے کہ جتنا ہندوستانیوں خصوصاً شمالی ہندوستان کے دیہات اور وہاں کے مسائل کا پریم چند کو تجربہ تھا، اس دور میں بہت کم لوگ، اتنی گہری نظر، حالات پر رکھتے تھے۔ کہہ نہیں سکتا کہ ظہیر احمد صدیقی صاحب نے کن تحریروں سے یہ نتائج اخذ کئے ہیں۔ تاہم ظہیر احمد صاحب کو اپنے نقطۂ نظر کو پیش کرنے کا تو حق ہے ہی۔ کوئی اس سے اتفاق کرے یا نہ کرے۔

یقیناً ظہیر احمد صدیقی کا ذہن تحقیق میں خوب چلتا ہے اور مومنؔ کی زندگی کا تو شاید ہی کوئی گوشہ ایسا ہو جس پر ظہیر احمد صاحب کی تلاش و تحقیق سے کوئی انکار کر سکے۔ اپنے ایک مقالے، مومن کے ناقدین میں جو بحث انھوں نے امتہ الفاطمہ عرف صاحب جی کے عشق اور وفات کے سلسلے میں کی ہے اور جو مشہور زمانہ روایت ہے کہ صاحب جی کا مرثیہ انہوں نے لکھا تھا اس کی تردید، ظہیر احمد صاحب نے خاصے تحقیقی نقاط اور اثبات سے کی ہے۔ اسی طرح مثنوی شکایت ستم، اور مثنوی قول غمیں، پر بھی ان کی بحث، ان

کے تحقیقی مزاج کا انکشاف کرتی ہے۔ انہوں نے مومن کے سلسلے میں یہ بڑی معنی خیز بحث اٹھائی ہے اور ابھی تک کے اس سلسلے میں تمام تسلیم شدہ باتوں پر سوالیہ نشان لگایا ہے۔

اس طرح میری نظر میں ظہیر احمد صدیقی ایک اچھے انسان، اچھے دوست، ایک علم دوست اور محتاط محقق ہیں۔ جنہوں نے اردو ادب کے مطالعے کے لئے منفرد، غیر روایتی اور قدرے دلچسپ راستے پیدا کئے ہیں۔ وہ صاحب طرز نقاد اور محقق نہ سہی مگر، ادب کے ایک محتاط طالب علم ضرور تھے ایسا طالب علم جو اپنے علم اور اپنی واقفیت کی روشنی میں تاریخ ادب اردو کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر علی احمد فاطمی
شعبہ اردو۔ الہ آباد یونیورسٹی
الہ آباد

ظہیر احمد صدیقی۔ تنقید کے کچھ پہلو

پروفیسر ظہیر احمد صدیقی اردو کے ان ممتاز سنجیدہ اور بزرگ ادیبوں و ناقدوں اور استازوں میں سے ہیں جنہوں نے اپنی پوری زندگی درس و تدریس۔ تحقیق و تنقید کے عمل مین گزاری ہے، وہ جس ماحول پس منظر کے پروردہ اور تربیت یافتہ ہیں وہاں علم و ادب کا شوق زندگی کا ایک اہم مقصد بلکہ اوڑھنا بچھونا رہا ہے۔ ان کے والد مرحوم ضیا احمد بدایونیؔ ادب و مذہب دونوں کے ایک بلند مرتبت عالم اور ادیب تھے اور ان مشرقی اقدار کے حامل جہاں شرافت تہذیب، تصوف، ادب سے باہم شیر و شکر ہو گئے تھے جہاں ادب صرف ادب نہیں ہوا کرتا تھا بلکہ مذہب۔ کلچر۔ تصوف۔ فقہہ وغیرہ کے حوالوں سے دیکھا جاتا تھا اور اپنی تمام قدیم، کلاسیکی اقدار اور افکار کے باوجود اس میں انسان دوستی رواداری اور روشن خیالی کے عناصر موجود ہوا کرتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمارے قدیم ادب اور ادبا کے درمیان تصوف وغیرہ کے حوالے سے مضبوط اور گہری جڑوں کے ساتھ انسانی دردمندی کی جو روایت پھلی پھولی ہے اور جس نے تمام مذاہب کے درمیان بڑے نمایاں کارنامے انجام دئے ہیں اور جسے جدید علوم و افکار نے بالکل ایک نئی صورت۔ آدرش اور نقطۂ نظر کے ذریعہ ایک تکنیکی قسم کی ترقی پسندی میں ڈھال دیا ہے اور جس سے جہاں کچھ فائدے پہنچے ہیں اچھے خاصے نقصانات بھی ہوئے ہیں، اس رواداری۔

پاسداری اخلاق اور انسان دوستی کی اس کلاسیکی روایت کو یاد کرنے اور کام کرنے کی شدید ضرورت ہے جس کے سلسلے مومنؔ، دردؔ، میرؔ۔ نظیرؔ سے ہوتے ہوئے کبیرؔ۔ امیر خسروؔ تک پھیلے ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی ایسی ہی مذہبی روایت کی گم ہوتی ہوئی نشانی کی طرح ہیں۔ فطرتاً و مزاجاً وہ بھی مشرقی مزاج و اخلاق کے مالک ہیں اور بقول شخصے۔ سیدھے سچے سنی مسلمان ہیں، ایسی صورت میں مومنؔ کی طرف توجہ بھی فطری ہے اور اس پر غیر معمولی کام کر جانا بھی فطری ہے ہر چند کہ اس غیر معمولی کام کے پیچھے ان کی ذاتی محنت۔ عرق ریزی اور شوق مطالعہ کا عمل دخل ہے۔ لیکن پھر بھی اس محنت کے پس پردہ ان کا فطری ذوق اور پس منظر کام کرتا دکھائی دیتا ہے۔ ویسے تو ظہیر صاحب نے اپنی زندگی میں بچے، جوان اور بوڑھوں کے لئے اب تک کل ملا کر تقریباً پچیس کتابیں لکھیں یا ترتیب دی ہیں لیکن ان کا سب سے بڑا کارنامہ مومن شخصیت اور فن ہے۔ انہوں نے دردؔ اور فانیؔ کی شاعری پر بھی کام کیا ہے اور وہ بھی کئی اعتبار سے قابل قدر ہے لیکن سچ یہ ہے کہ ان کی شناخت مومنؔ کے غیر معمولی کام سے ہوئی۔

اردو زبان و ادب کے ایک ممتاز و معروف استاد اور ادیب ہونے کے ناتے گزشتہ دہائیوں میں انھوں نے وقتاً فوقتاً مضامین بھی لکھے جو فکری زاویے اور احساس و ادراک کے عنوانات سے شائع ہوئے اور بھی بہت سے کام کیے ان کاموں کے ذریعہ جہاں ان کو شہرت، مقبولیت ملی وہیں یہ بھی ہوا کہ ان کی دلچسپیوں اور کارگزاریوں کے اصل میدان بھی واضح ہوئے، بزرگ ادیبوں کے بارے میں ایک الزام یہ لگتا رہا ہے کہ وہ جدید ادب اور اس کی راہوں و سمتوں سے ناواقف نہ سہی تو بے نیاز اور بے فکر تو رہتے ہی ہیں یہ الزام کسی حد تک درست بھی ہے اور شاید یہ الزام ظہیر احمد صدیقی پر بھی لگ جاتا اگر انہوں نے جدید شاعری اور میزانِ قدر کے عنوان سے مضامین کے دو مجموعے ایک

کچھ اپنے بارہ میں

(حصہ اول)

میری پیدائش ۱۹۲۸ء میں بدایوں میں ہوئی ''آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ''۔ یہ حقیقت ہے کہ موجودہ دور کی کشمکش اور الجھنوں میں گرفتار انسان جب اپنے گزرے ہوئے زمانہ کے واقعات اور بیتے ہوئے لمحات کو یاد کرتا ہے تو اسے بڑے سکون کا احساس ہوتا ہے اور اسے لگتا ہے جیسے وہ جلتی ہوئی دھوپ میں چلتے چلتے اچانک کسی گھنے درخت کی ٹھنڈی چھاؤں میں پہنچ گیا ہو۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ گزرے ہوئے زمانہ کی یادوں میں بھی سب سے خوبصورت اور خوشگوار یاد بچپن کی یاد ہوتی ہے۔ یہ ہی وہ زمانہ ہوتا ہے جب انسان ہر فکر سے آزاد اور ہر پریشانی سے دور ہوتا ہے۔ اس کی خواہشات، محدود ہوتی ہیں اور چھوٹی چھوٹی چیزیں اسے لامحدود خوشیاں دے دیتی ہیں۔ وہ اپنی مرضی کا مالک ہوتا ہے۔ اس کے سامنے کوئی جھوٹی مصلحت، کوئی بناوٹی اور مصنوعی معیار اور کسی طرح کی چھل کپٹ نہیں ہوتی۔ وہ ایک معصوم فطرت کا مالک ہوتا ہے اور کسی سے نفرت یا دشمنی نہیں رکھتا۔

ظاہر ہے کہ تمام دوسرے لوگوں کی طرح ہمیں بھی اپنے بچپن کی یادیں بہت عزیز ہیں۔ بچپن کا ذکر آتے ہی ذہن میں کتنے ہی واقعات سنیما کی تصویروں کی طرح

ہی سال (۹۳ء) میں شائع نہ کردئے ہوتے۔

جدید شاعرہ میں جیسا کہ وہ خود اعتراف کرتے ہیں۔ ''موجودہ مجموعہ صرف شاعری سے متعلق ہے اور شاعری میں بھی جدید شاعری کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔'' حالانکہ اس میں دو مضامین (آدمی نامہ۔ تین زاویئے۔ سیماب کی غزل گوئی) ایسے ہیں جنہیں جدید شاعری کے ضمن میں شامل کئے جانے میں ایک نہیں ہزار تکلف ہو سکتے ہیں اگرچہ نظیر کی نظم آدمی نامہ کو انہوں نے دو مختلف تخلیقات کے حوالے سے حالیہ تناظر میں دیکھا ہے۔ یہ ایک دلچسپ مطالعہ بھی ہے اور میرے اس خیال کو تقویت پہنچاتا ہے جس میں انسان دوستی کے اس صوفیانہ تصور پر نئے سرے سے غور کرنے کی بات عرض کی ہے۔ لیکن سیمابؔ اکبرآبادی سے متعلق اہل علم واقف ہیں کہ وہ ایک استاد شاعر تھے اور یہ صحیح ہے کہ دبستانی تنازعات نے ان کی شاعری اور شعری افکار کی قدر و قیمت کا مناسب تعین نہیں ہونے دیا پھر بھی ان کی کلاسیکی شعریت، استادی اور قادرالکلامی کے پیش نظر ظہیر صاحب کا یہ دعویٰ۔ ''سیماب نے غزل کے میدان میں بھی اپنے نہ مٹنے والے نقوش چھوڑے ہیں۔ سیمابؔ کو جدید غزل گو شعراء میں شمار کیا جائیگا ان کی غزل ہمارے عہد کی آواز ہے وہ اپنی اس نئی آواز کی بدولت ہمارے زمانے کے منفرد شاعر ہیں۔'' بحث طلب ہو سکتا ہے اور تبادلہ خیال تو اس پر بھی ہو سکتا ہے کہ منفرد شاعر ہونا تو الگ ایک خاص معنوں میں وہ ''جدید'' شاعر ہیں بھی یا نہیں۔ اس قسم کی جدید شاعری جس پر آگے چل کر وہ ایک بہت اچھا مضمون بعنوان 'جدید شاعری' رقم فرماتے ہیں۔ جدید شاعری ان کا معرکے کا مضمون ہے جو ان کی بصیرت۔ گہرائی اور گیرائی کا بھرپور اظہار کرتا ہے ساتھ ہی اس بات کا اعلان و اظہار بھی کہ ظہیر صاحب کا ذہن اور قلم شاعری کے میدان میں بہتر اور مدلل اور منطقی انداز میں کام کرتا ہے۔ فراق۔ فیضؔ، جذبی وغیرہ پر لکھے گئے مضامین اس بات کی تائید کرتے ہیں اور سچ یہ ہے کہ پرانے زمانے میں ادب کا مطلب شاعری اور تنقید کا مطلب شاعری کی تنقید سمجھا جایا کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم تنقیدی سرمایے میں نثری

اصناف پر تنقید نہیں کے برابر ملتی ہے۔ قدیم کلاسیکی نثر کی تنقید کا زیادہ تر سرمایہ جدید تنقید کا مرہون منت ہے اور جیسا کہ عرض کیا گیا کہ ظہیر صاحب اسی مشرقی اقدار و روایات کے امین ہیں اور شاید علمبردار بھی حالانکہ انھوں نے اپنے دوسرے مجموعے میزان قدر میں بعض نثری موضوعات کا انتخاب کر کے اس بھرم اور غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کی ہے اور پریم چند۔ ابوالکلام آزاد، خواجہ احمد عباس پر مضامین لکھے ہیں حالانکہ اس مجموعہ میں بھی وہ اپنا پیچھا نظیر اکبر آبادی۔ آزردہ۔ داغ۔ شبلی سے بالعموم اور مومن سے بالخصوص نہیں چھڑا پائے ہیں، پھر بھی نثر کے ان فنکاروں پر لکھے گئے ان مضامین میں فکر انگیز باتیں ہیں جو غور طلب تو ہیں ہی بحث طلب بھی ہیں۔ مولانا آزاد پر لکھے گئے ان کے دو مضامین تو یقیناً اچھے ہیں لیکن پریم چند اور خواجہ احمد عباس پر لکھے گئے مضامین تنازعاتی ہیں اور ان پر خاصی بحث ہو سکتی ہے۔ پریم چند پر مضمون اگرچہ انہوں نے بڑی محنت سے لکھا ہے اور معروضی انداز سے پریم چند کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے، ان کی غیر معمولی خدمات اور فنکاری کا اعتراف کرتے ہوئے انہوں نے پریم چند پر جو اعتراضات کئے ہیں وہ ہر چند کہ نئے نہیں ہیں پھر بھی ظہیر صاحب نے کچھ سوالات اٹھا کر اسے ایک الگ رنگ دینے کی کوشش کی ہے، پریم چند اور مہاتما گاندھی کے نظریاتی تعلق سے پریم چند کی ترقی پسندی کو لے کر ہندی ادب میں تو خاصی بحث ہو چکی ہے اردو میں بھی کم نہیں ہے۔ ظہیر صاحب نے بھی تقریباً انہیں باتوں کو اپنے انداز میں پیش کرتے ہوئے پریم چند کو ایک سپاٹ اور غیر انقلابی نوعیت کا افسانہ نگار قرار دیا۔ وہ لکھتے ہیں۔

''گاندھی جی سے ان کی عقیدت ان کی قوت بھی تھی اور ان کی کمزوری بھی۔ اہنسا کی قوت کا اندازہ ان کو گاندھی جی کے عزم سے ہوا۔ بے باکی۔ سچائی۔ حق گوئی۔ ظلم کو برداشت کرنے کی قوت، یہ وہ عناصر تھے جو پریم چند کے مثالی کرداروں کا مزاج بن گئے۔ مگر اس گاندھیائی طریقہ فکر کو اپنانے کے باعث ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے افسانوں کی اٹھان ماری گئی۔ وہ گاندھی جی کی عینک سے دیکھنے کے اس قدر عادی ہو گئے

تھے کہ اس سے الگ ہٹ کر دیکھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔''

ایک جگہ اور لکھتے ہیں۔

''انقلاب جس تیز روی کا مطالبہ کرتا ہے وہ پریم چند کے یہاں نہیں ہے۔ انقلابی ہتھوڑے چلاتا ہے وہ اتنا انتظار نہیں کرتا کہ حالات میں تبدیلی ہو تو وہ اپنا لائحہ عمل متعین کرے پریم چند کے یہاں ایک سبک خرام جوئے رواں کی طرح صرف اس قدر مقصد ہے کہ وہ اپنے پانی کو پھیلا دے اور اس سے جو فائدہ اٹھانا چاہے اٹھا سکتا ہے۔''

اور یہ جملے بھی ملاحظہ کیجئے۔

''تیسری نمایاں کمزوری ان کے سماجی نقطۂ نظر اور سماجی بصیرت (vision) کی کمی ہے۔ پریم چند سماجی امراض کا نسخہ پیش کرنا تو درکنار صحیح تشخیص سے بھی قاصر تھے۔''

ہر عظیم فنکار کی طرح پریم چند کے یہاں بھی تضادات و تنازعات ہیں فکر و احساس کی کچھ کمزوریاں بھی۔ یہ ایسی کوئی بڑی بات نہیں فنکار بھی انسان ہی ہوتا ہے اور ایک فنکار کی غور و فکر میں بڑے اتار چڑھاؤ آیا کرتے ہیں، دیکھنا یہ ہے کہ بحیثیت مجموعی وحدت فکر و تاثر کی کیا شکل بن رہی ہے اور اس کی آتما سے کیا پیغام پھوٹ رہا ہے۔ ضروری نہیں کہ وہ پیغام نعرہ زنی کے مترادف ہو ایک دھیمے ٹھہرے فلسفے کے روپ میں بھی ہو سکتا ہے۔ جس طرح مذہبی عقیدتوں کے بڑے روپ ہوا کرتے ہیں اسی طرح ترقی پسندی کے بھی بڑے روپ ہوا کرتے ہیں۔ ترقی پسندی کو ایک خاص تناظر یا کمٹمنٹ کو ایک ڈھلے ڈھلائے تصور میں لینا کسی طرح مناسب نہیں ترقی پسندوں نے کبھی یہ اعلان نہیں کیا کہ ان کا منی فیسٹو ہی ترقی پسندی کا نقطہ آغاز ہے۔

آج صورت یہ ہے کہ آپ اشتراکیت کے قائل ہوں یا نہ ہوں۔ مارکسزم پر

آپ کا عقیدہ ہو یا نہ ہو۔ مزدور کسان کے مسائل پر آپ قلم اٹھائیں یا نہ اٹھائیں لیکن آپ ان سنگین مسائل سے آنکھیں نہیں چرا سکتے جن کا تعلق ملک و معاشرہ سے ہوا کرتا ہے اور اب تو ساری دنیا سمٹ چکی ہے لیکن ہمارے شاعر نے تو بہت پہلے ہی کہا تھا۔

خنجر کہیں چلے پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ

سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

پریم چند کی ترقی پسندی بھی ترقی پسندی کے کئی چہروں میں سے ایک ہے۔ خود پریم چند سوشلزم، مارکسزم اور کل ملا کر ترقی پسندی کو کس طرح لیتے تھے یہ ایک لمبی بحث ہے لیکن سوشلزم۔ مارکسزم کے تصورات اور انقلاب کے چیختے ہوئے نعروں اور ہتھوڑوں کے دور سے پریم چند کے ادب کو آنکنا شاید مناسب نہ ہوگا۔ پریم چند کی تفہیم پریم چند کے دائرے میں رہ کر کرنی ہوگی۔ اور ان حالات۔ پس منظر اور ان راہوں کو سمجھنا ہوگا جن پر چل کر پریم چند نے اپنا ذہنی سفر طے کیا۔

انھوں نے ہندوستانی معاشرہ اور افرادِ معاشرہ۔ طبقاتی کشمکش۔ غربت و افلاس کو جتنا قریب سے دیکھا اور پیش کیا وہ اب تک کوئی نہ کر سکا ایسی صورت میں ان کی سماجی بصیرت اور ترقی پسندی پر شبہ کرنا صرف ان کے ساتھ ہی ناانصافی نہیں ہے بلکہ اس پوری ایماندارانہ سوچ اور مخلصانہ عمل پر ایک حملہ کے مترادف ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اپنے اس مضمون میں ظہیر احمد صدیقی صاحب نے پریم چند شناسی کی ایک اچھی تصویر پیش کی ہے اور پورے خلوص و ایمانداری کے ساتھ ان کے کارناموں کو ایک نیا رنگ اور زاویہ دینے کی کوشش کی ہے۔ بس مشکل یہ ہوئی کہ ظہیر صاحب جس دبستان فکر کے قلمکار و مفکر ہیں وہاں اشراکیت و اشتمالیت کی جدید ترین و ارتقائی صورتوں کی دھمک نہیں پہنچی۔ حالانکہ اس نئی صورت کے ڈانڈے اس

صوفیانہ روایت سے کہیں نہ کہیں جا کر ضرور ملتے ہیں جسکا تعلق انسان دوستی سے اور عالمی برادری سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ اپنا مضمون۔ اردو میں دانشوری کی روایت۔ لکھتے ہیں تو شبلی، حالی سے ہوتے ہوئے سرسید۔ آزاد تک پہنچکر مولانا سلیمان ندوی مولانا ابوالحسن ندوی اور مولانا حسین احمد مدنی پر آ کر رک جاتے ہیں اس تحریک اور رجحان کا ذکر نہیں کرتے جس نے اردو دانشوری کو وقار اور وسعت اور بین الاقوامیت عطا کی۔ سجاد ظہیر، سبط حسن عبدالعلیم۔ سردار جعفری وغیرہ نے جس طرح اردو دانشوری کی سرحدیں عالمی فکر سے ملائیں ہیں وہ ایک زندہ حقیقت اور تاریخ کا سنہرا باب بن چکے ہیں اور اس کا اعتراف وہ اپنے ایک مضمون اخلاقی اقدار اور اردو ادب میں کرتے ہیں۔ اسی طرح انہوں نے اردو کی ''سماجی اور تمدنی قدر و قیمت'' کے عنوان سے بھی ایک عمدہ مضمون رقم کیا ہے۔ جو ظہیر صاحب کی وسعت علم۔ کلچر سے گہری دلچسپی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ ان مضامین سے ایک نئے ظہیر صاحب کی، محض ادیب اور نقاد نہیں، بلکہ ایک دانشور، مفکر ظہیر احمد صدیقی کی تصویر ابھرتی ہے جو دلکش ہے اور جامع بھی۔ ان تمام کامیاب اور فکر انگیز مضامین کے باوجود یہ کہنے میں تکلف نہیں کہ ظہیر صاحب اصلاً شاعری کے نقاد ہیں۔ شعری موضوعات پر جس طرح ان کی فکر کام کرتی ہے اور جس رواں دواں طریقہ۔ استدلال اور توازن کے ساتھ لکھتے چلے جاتے ہیں وہ کیفیت ان کے نثر اور بالخصوص ترقی پسند نثر نگاروں پر پڑھتے ہوئے محسوس نہیں ہوتی۔ انہوں نے پریم چند، خواجہ احمد عباس وغیرہ پر یقیناً کچھ فکر انگیز باتیں اٹھائیں ہیں اور پوری جرات و بے باکی کے ساتھ۔ اور اس میں کچھ نئی باتیں بھی ہیں لیکن اس سے زیادہ پرانے الزامات کی بو آتی ہے جو عموماً ترقی پسند ادب پر لگا کرتے ہیں مثلاً خواجہ احمد عباس پر لکھتے ہوئے بھی انہوں نے بطور تمہید لکھا۔ ''ادیب۔ اپنی تخلیقات کے ذریعہ انسانیت کے درپیش مسائل کو نہ صرف بیان کردے بلکہ اس کا حل بھی تلاش کرنے کی کوشش کرے۔۔''

یہ بات دانشوری کی سطح پر تو ضرور سوچی جا سکتی ہے لیکن تخلیق کی سطح پر ایسا ضروری نہ پہلے تھا اور آج تو بالکل ہی نہیں ہے، پھر آج تو ترقی پسندی کو برتنے اور محسوس کرنے کے نہ وہ معیار رہ گئے ہیں اور نہ رویے۔ بہت کچھ بدل چکا ہے اور بدلتا رہتا ہے اور یہی ترقی پسندی ہے۔ لیکن اگر ان کے مضامین سے اختلاف ہوتا ہے تو یہ ان کے عمدہ اور معیاری ہونے کی دلیل ہے۔ ان دونوں مجموعوں میں جتنے بھی مضامین ہیں وہ جتنے بحث طلب ہیں اتنے ہی فکر انگیز اور توجہ طلب، جو ظہیر صاحب کی فکر، سلیقے اور صالح روایت کا پتہ دیتے ہیں۔

ظہیر احمد صدیقی کے فکر و خیال کے بارے میں خواہ کتنی بحث کی جائے لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ وہ ایک سنجیدہ اور مشرقی اقدار کے ادیب و ناقد ہیں۔ ہر چند کہ ان مجموعوں سے ایک نئے ظہیر صاحب کا تعارف سا ہوتا ہے پھر بھی وہ اس دبستان کے قلم کار ہیں جہاں پڑھنا لکھنا صرف شوق اور ضرورت نہیں بلکہ عبادت کے طور پر کیا جاتا ہے اسی لئے وہ سرتاپا اردو کا، اردو تہذیب کا مزاج و مذاق رکھتے ہیں اور اردو کی خدمت میں مصروف رہتے ہیں۔

☆☆☆

پروفیسر ظہیر احمد صدیقی اور مومن شناسی کی روایت

پروفیسر ظہیر احمد صدیقی ہمارے عہد کے سب سے بڑے اور سب سے مستند مومن شناس ہیں۔ انہیں یہ روایت اپنے والد محترم پروفیسر ضیاء احمد بدایونی سے ورثے میں ملی ہے۔ اس چشمۂ علم سے بے شمار لوگ سیراب ہوئے۔ اور محض آپ ہی سے اکتساب فیض کر کے آسمان علم وادب کے درخشندہ ستارے بنے۔ آپ کے فیض کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ پروفیسر ظہیر احمد صدیقی اس علمی وراثت کے امین ہیں۔

مومن شناسی کی روایت پروفیسر ضیاء احمد بدایونی نے قایم کی۔ مومن شناسی سے میرا مطلب ہے شاعر بے بدل حکیم مومن خاں مومن کے کلام کو سمجھنا، دوسروں کے لئے اس تفہیم کی راہیں کھولنا، اور اردو شعرا کی صف میں ان کے صحیح مقام کا تعین کرنا۔ مومن اردو کلاسیکی شعرا میں منفرد اور ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ وہ اردو شاعری کے بلند و بالا اور عالیشان ایوان کے ستونوں میں ہیں۔ ایسا ستون جو عمارت کو نہ صرف استحکام بخشتا ہے۔ بلکہ اس کے حسن و جمال اور شان و شوکت میں اضافہ بھی کرتا ہے۔ انہوں نے اردو شاعری، بالخصوص اردو غزل کے دامن کو تغزل، شوخی ادا، نازک خیال، نکتہ یابی اور شگفتگی جیسی لطیف خصوصیات سے مالا مال کیا اور اسے نئی بلندیوں سے روشناس کرایا۔ وہ معاملہ

بندی نازک خیالی اور ندرت بیان میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ یہی خصوصیات انہیں دوسرے شعرا سے ممتاز کرتی ہیں۔ لیکن یہی ان کی عدم مقبولیت کا سبب بھی بنیں۔ ان کے مزاج میں مشکل پسندی بہت تھی اسی لئے ان کی نازک خیالی اور معاملہ بندی انہیں اکثر اوقات سلاست وروانی اور سہل ممتنع کی راہ سے ہٹا کر سنگلاخ میدانوں اور مکر شاعرانہ کے خارزار میں لے جاتی ہے۔ یہی وہ منزل ہے جہاں وہ عام سطح سے بلند ہو کر عوام سے دور ہو جاتے ہیں۔ عام اذہان ان کی رفعت تخئیل تک نہیں پہنچ پاتے ہیں۔ چنانچہ ان کے اشعار کبھی عوام پسند نہ ہو سکے اور انہیں وہ قبول عام نصیب نہ ہو سکا جس کے وہ صحیح معنیٰ میں مستحق تھے۔ وہ اپنے زمانہ میں ہی ناقدری اور ناقدین ادب کی عدم توجہ کا شکار ہو گئے اور کسی نہ کسی حیثیت سے یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ اس ناقدری زمانہ کا احساس انہیں خود کو بھی بے حد تھا۔ چنانچہ ان کے کلام میں اس نوع کے اشعار کافی بڑی تعداد میں نکل آئیں گے جن میں زمانے کی ناقدری اور اہل علم ودانش کی بے توجہی کا ماتم کیا گیا ہے۔ اسی طرح نثر میں بھی، بالخصوص احباب کے نام خطوط میں اس قسم کے شکایتی کلمات ان کی نوک قلم سے نکل جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر حکیم احسن اللہ خاں کے نام متعدد خطوط میں انہوں نے اپنے علوے فن کا اظہار جو تعلّی اور مبالغہ کی انتہا کو پہنچا ہوا ہے، اور زمانے کی ناقدری کا شکوہ کیا ہے۔

اس میں مبالغہ آرائی اور شاعرانہ تعلّی ضرور ہے لیکن ہے بڑی حد تک مبنی بر حقیقت۔ یہ ناقدر شناسی ہمارے ادیبوں۔ شاعروں اور دانشوروں کا مقدر بن چکی تھی۔ مومن گو آج تک اس ناقدری کا شکار بنے رہے۔ البتہ اتنا ضرور ہوا کہ انفرادی کوششوں سے کسی نہ کسی طرح ادبی حلقوں میں وہ زندہ رہے۔ اسی سلسلہ میں سب سے پہلے توجہ پروفیسر ضیاء احمد بدایونی نے فرمائی۔ جس زمانے میں لوگ مومن کو بالکل فراموش کر چکے تھے اور صرف ذوق اور غالب کا طوطی بول رہا تھا اور ہمارے دانشور غالب کے کلام کی تعبیر وتشریح پر اپنا سارا زور صرف کر رہے تھے اس زمانہ میں پروفیسر ضیاء احمد بدایونی نے

مومن کے قصائد کی شرح لکھ کر لوگوں کو مومن کی جانب متوجہ کیا اور ان کے پیچ در پیچ اور تہہ در تہہ اشعار کو سمجھنے میں مدد کی۔ یہ ۱۹۲۵ کی بات ہے۔ آپ کی اس کوشش کی تمام ادبی حلقوں میں زبردست پذیرائی ہوئی اور سب نے اس کی بے حد تعریف و تحسین کی۔ اس کے بعد ۱۹۳۳ میں آپ نے دیوان مومن کا مستند ترین نسخہ مرتب فرمایا اور مع شرح اسے شایع کرایا۔ مومن کی معمیات کو سمجھنا انتہائی دشوار کام ہے اور ان کی تشریح کرنا دشوار تر۔ لیکن ضیاء احمد صاحب نے اس کام کو محنت اور دقت نظر سے انجام دیا اور سلیس و عام فہم انداز میں پیش کیا۔ اس سے ان کے علمی تبحر کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس سے مومن شناسی کی نئی راہیں کھلتی ہیں۔ کلام مومن کی صحیح تفہیم کے لئے اساتذہ و طلبہ دونوں کے لئے اس سے استفادہ ناگزیر ہے۔ اس کو بھی بے مثال قبول عام نصیب ہوا۔ اب تک اس کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ اس کے علاوہ مومن کے کلام کے تنقیدی مطالعہ کے سلسلہ میں پروفیسر ضیاء احمد بدایونی صاحب قبلہ کے کم از کم تین طویل اور مبسوط مضامین بھی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ان کا پہلا مضمون ''کلام مومن پر ایک نظر'' پہلی بار سہ ماہی اردو۔ اورنگ آباد (اکتوبر۔ دسمبر ۱۹۲۷) میں، دوسرا ''مومن کی طنزیہ شاعری'' کے عنوان سے ماہنامہ ہمایوں لاہور (نومبر ۱۹۲۹) میں، اور تیسرا ''مثنویات مومن'' سہ ماہی اردو ادب علی گڑھ (جون ۱۹۵۷) میں شایع ہوا۔ اس کے علاوہ ایک نسبتاً مختصر لیکن اہم مضمون کلام مومن کا نفسیاتی مطالعہ (فاران۔ کراچی، مئی ۱۹۴۹) بھی مومن شناسی کی روایت میں ایک اہم کڑی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس طرح مومن کو تعرگمنامی سے نکال کر قبول عام و شہرت دوام کی شاہراہ پر لا کھڑا کرنے میں پروفیسر موصوف نے لاثانی خدمات انجام دی ہیں۔

مومن شناسی کی روایت کو آگے بڑھانے میں نیاز فتحپوری نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ انہوں نے ۱۹۲۸ میں اپنے مشہور زمانہ رسالہ نگار۔ لکھنؤ کا مومن نمبر شایع کیا۔ اس میں خود نیاز فتحپوری کے علاوہ جناب سید امتیاز احمد، مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی اور مولانا

عبدالباری آسی کے تنقیدی مضامین شامل ہیں۔ اس کے تقریباً ۳۰، ۳۲ سال بعد اس کا نظر ثانی شدہ ایڈیشن شایع ہوا جس میں کئی مضامین کا اضافہ کیا گیا۔ ان میں موضوعات کا تنوع بھی ہے اور ضخامت میں معتد بہ اضافہ بھی۔ ان تمام مضامین میں سارا زور نقد، فن پر ہے، متن کی تشریح و تفہیم کی جانب توجہ نہیں دی۔

اس کے بعد مومن پر مکمل، جامع اور انتہائی وقیع کام پروفیسر ظہیر احمد صدیقی نے انجام دیا۔ آپ نے مومن پر تحقیقی مقالہ سپرد قلم کیا اور اس پر دہلی یونیورسٹی سے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ بعد میں نظر ثانی اور مزید اضافوں کے ساتھ ۱۹۷۲ء میں اسے کتابی شکل میں شایع کیا۔ مقالہ تیار ہونے اور پھر زیور طبع سے آراستہ ہونے کے درمیان کافی طویل وقفہ ہے۔ اس دوران چند دیگر ناقدین و محققین نے مومن کی جانب نظر التفات کی۔ اور ان پر ناقدانہ و سوانحی کتابیں تالیف کیں۔ ان میں سب سے زیادہ اہم اور جامع کام جناب کلب علی خاں فائق رامپوری کا ہے۔ آپ کی کتاب ''مومن۔ حالاتِ زندگی اور ان کے کلام پر تنقیدی نظر''، مجلس ترقی ادب لاہور سے ۱۹۶۱ میں شایع ہوئی۔ یہ ضخیم کتاب ۴۲۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ فائق پہلے محقق ہیں جنہوں نے مومن کے حالات زندگی بھی قلم بند کئے۔ اور ان کی جملہ تصانیف نظم و نثر پر تحقیقی اور ناقدانہ نظر ڈالی۔ آپ کے علاوہ اردو کے معروف نقاد ڈاکٹر عبادت بریلوی نے بھی ایک کتاب مومن اور مطالعہ مومن، لکھی۔ اس میں تحقیق کم ہے، اور جتنی ہے وہ ناقص اور غیر معتبر ہے اور بہت سے غیر ضروری شکوک و شبہات کو جنم دیتی ہے، سارا زور تنقیدی مطالعہ پر صرف کیا ہے لیکن اس سے بھی نقد و نظر کی نئی راہیں نہیں کھلتیں۔ ان دو حضرات کے علاوہ بھی چند دیگر ناقدین ادب نے مومن شناسی کے سلسلہ میں کوششیں کیں لیکن ان سے مومن سے متعلق معلومات میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوتا۔ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو سب سے زیادہ جامع، ہمہ گیر اور وقیع کام ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی کا ہی نظر آئے گا۔ اس سلسلہ میں اب تک آپ کی دو کتابیں شایع ہو چکی ہیں:

سامنے آتے چلے جاتے ہیں۔ اگرچہ ہمارے بچپن میں بہت سی آرام آسائش اور تفریح کی چیزیں جو آج کے بچوں کو حاصل ہیں ان کا تصور بھی نہیں تھا۔ نہ آج کل کے زمانہ کی طرح عمدہ عمدہ کھلونے اور لباس ہوتے تھے نہ اس زمانہ میں بچوں کو اتنی اہمیت دی جاتی تھی جتنا کہ آج دی جاتی ہے مگر بے فکری کی دولت اور ماں باپ اور بھرے گھر کی شفقت کی نعمت ہمیں دل بھر کے ملی ہوئی تھی۔ جس کی بدولت ہم اپنی چھوٹی سی دنیا میں مگن تھے اور اپنے کو بے ملک کا بادشاہ سمجھتے تھے۔ بقول شاعر۔

وہ ٹاٹ کا اک بوریا وہ مسند شاہی انور کے مچلکے وہ شکیلہ کی گواہی

مسند پہ مرا بیٹھ کے وہ حکم سنانا بھولا ہے نہ بھولے گا وہ بچپن کا زمانہ

بچپن کی یادوں کے ساتھ بہت سی شخصیتوں کی یاد بھی آجاتی ہے۔ اور کتنے ہی چہرے نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں جن میں ماں باپ بھائی بہن۔ استاد ساتھی سب ہی شامل ہیں۔ کچھ لوگ تو اب اس دنیا میں ہی نہیں رہے۔ کچھ کو زمانہ کے سیلاب نے بہا کر اتنا دور پہنچا دیا ہے کہ ان سے صرف تصور ہی میں ملاقات ہوسکتی ہے اور کچھ خدا کے فضل سے اب بھی ہم سے دور نہیں ہیں۔ مگر جب یادوں کی دوربین آنکھوں پر لگا کر دیکھتے ہیں تو ہر چہرہ اور ہر آدمی ہمیں اپنے قریب ہی نظر آتا ہے۔ ہم اپنے بھائیوں میں بیچ کے نمبر پر تھے۔ یعنی دو بھائی ہم سے بڑے تھے اور دو ہم سے چھوٹے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہم نہ تو بڑوں کی طرح سب پر رعب ڈال سکتے تھے اور نہ چھوٹوں کی طرح ضد کر کے اپنی ہر بات منوا سکتے تھے۔ مگر بھلا کرے ہمارے بڑے بھائی کا جن سے گھر میں ہماری سب سے زیادہ دوستی بھی تھی اور جن کی غیر معمولی شرارتوں کی وجہ سے ہماری قدر اور اہمیت بھی زیادہ ہوگئی تھی۔ ان کی وجہ سے ہمیں بہت سے فائدے بھی حاصل ہوجاتے تھے۔ اور ہماری بعض شرارتیں انہیں کے کھاتے میں چلی جاتی تھیں مگر کبھی کبھی ان کے بہکائے میں آکر ہم سے ایسی حرکتیں بھی سرزد ہوجاتی تھیں جن کا خمیازہ ہمیں والد کی مار یا

۱۔ مومن۔شخصیت اورفن۔ دہلی یونیورسٹی۔دہلی۔ ۱۹۷۲

۲۔انشائے مومن (ترتیب وترجمہ) غالب اکیڈمی نئی دہلی۔۱۹۷۷

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا 'مومن۔شخصیت اورفن' اصلاً ان کا تحقیقی مقالہ ہے۔ اس کی تیاری میں انہوں نے تمام دستیاب مآخذ سے بھرپور استفادہ کیا اور نہ صرف مطبوعہ بلکہ غیر مطبوعہ مواد تک رسائی حاصل کی اور اپنی تحقیق کو مستند اور جامع بنایا۔اس مقالے کو انہوں نے حسب ذیل ۷ ابواب اور تین ضمیموں میں تقسیم کیا ہے:

۱۔سیاسی، سماجی اور ادبی پس منظر ۲۔حیات وسیرت

۳۔مومن کی اردو شاعری ۴۔فارسی تصانیف

۵۔مومن اسکول ۶۔مومن تنقید کی نظر میں

۷۔اردو شاعری میں مومن کا مقام

ضمیمہ ۱۔تلامذۂ مومن۔ضمیمہ ۲۔مومن کی مخصوص تراکیب الفاظ اور محاورے۔ ضمیمہ ۳۔فہرست رسایل وکتب اس کی تیاری میں ظہیر صاحب نے کتنی تلاش وجستجو محنت اور جگر کاوی سے کام لیا ہے،اس کا اندازہ اس وقت ہوگا جب ہم اس کا تقابلی مطالعہ ان کتابوں سے کریں جو اس موضوع پر اب تک منظر عام پر آچکی ہیں۔ان میں کلب علی خاں فائق کی کتاب کے مطالب ومشمولات بڑی حد تک ظہیر صاحب کی کتاب سے مشابہ ہیں۔انہوں نے بھی کمال تحقیق سے کام لیا ہے۔ظہیر صاحب اگر چاہتے تو اسی کو بنیاد بنا کر اپنی تحقیق کی عمارت کھڑی کر سکتے تھے،لیکن ان کے منصفانہ مزاج اور مشکل پسند طبیعت نے اسے گوارا نہ کیا،،اور آزادانہ وجداگانہ طور پر اپنے تحقیقی سفر کو جاری رکھا اور منفرد انداز سے غیر جانبدارانہ طور پر نتائج اخذ کیئے۔اور بقول پروفیسر خواجہ احمد فاروقی:

''طالب آملی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے اس مصرع کے لکھنے میں چھ مہینے صرف کیئے تھے:

زغارت چمنت بر بہار منت ہاست

صدیقی صاحب نے اس مقالے کے ایک ایک باب پر اس سے زیادہ وقت صرف کیا ہے، تب کہیں جا کر اس ادائے خاص سے نکتہ سرائی کی ہے۔''

فائق نے بعد از تلاش بسیار مومن کے ۳۸ شاگردوں کی نشاندہی کی ہے۔ ظہیر صاحب نے اس تحقیق کو آگے بڑھایا اور ان کی تعداد کو ۴۴ تک پہنچا دیا۔ اسی طرح مومن اسکول کے عنوان سے جو باب قائم کیا ہے وہ اپنی اہمیت کے لحاظ سے منفرد ہے۔ اس میں انہوں نے مومن کے تلامذہ اور دیگر معاصرین پر مومن کے اثرات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اسی ذیل میں انہوں نے مومن کے صفِ اول کے شاگردوں کے ایسے اشعار بھی کثرت سے پیش کیے ہیں جن میں نمایاں طور پر مومن کا رنگ جھلکتا ہے۔

یہ باب صدیقی صاحب کے کثرت مطالعہ، فن شاعری کی تفہیم اور اس پر غیر معمولی گرفت کا پتہ دیتا ہے۔ اس تقابلی مطالعہ سے انہوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ:

''مومن کے بعض تلامذہ پر رنگ مومن اس قدر چھایا ہوا ہے کہ بعض اوقات دونوں میں امتیاز مشکل ہو جاتا ہے۔ خیال و زبان کو دیکھ کر ایک خالی الذہن شخص بے ساختہ پکار اٹھے گا کہ مومن بول رہے ہیں۔ ممکن ہے کہ کوئی اس کو تلامذہ مومن کے یہاں انفرادیت کی کمی پر محمول کرے مگر ہم تو اس کو طرز مومن کی مقبولیت کا کرشمہ ہی کہیں گے'' (ص ۴۳۸)۔ اسی کے ساتھ صدیقی صاحب کا یہ بھی فرمانا ہے کہ اس یک رنگی یا اسلوب بیان اور مضمون آفرینی میں مماثلت سے یہ مطلب ہرگز نہ نکالنا چاہیئے کہ مومن اسکول نے اردو شاعری میں کچھ اضافہ نہیں کیا اور تمام شاگرد صرف استاد کی نقالی ہی کرتے

رہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ان میں سے بیشتر نے اپنی انفرادیت قایم رکھی اور لطافت بیان ورعنائی خیال کے وسیلے سے اردو شاعری بالخصوص اردو غزل میں قابل قدر اضافے بھی کئے۔ فرماتے ہیں:

''تلامذہ مومن کا رنگ مومن سے اس قدر متاثر ہونا۔۔۔ اس امر کو ملتزم نہیں کہ ان لوگوں نے استاد کی نقالی پر اکتفا کیا اور چابے ہوئے نوالوں کو دوبارہ چبایا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے اکثر کے یہاں وہ رعنائی خیال اور لطافت بیان ملتی ہے جو شعرائے دہلی کا سرمایہ ناز ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ان کے یہاں لطیف تغزل کی چاشنی ہے جو مومن کا فیضان ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی ان کے کلام میں ایسے برگ و بار بھی نظر آتے ہیں جو زمانے کے ارتقائی حالات کا نتیجہ ہیں۔ یہ انداز بیان اپنے اندر ایک طرح کی انفرادی شان رکھتا ہے جس کو نہ شاہ نصیر کی سنگلاخ ردیف و قافیہ پیمائی سے نسبت ہے نہ ناسخ کی لفاظانہ صناعی سے اور نہ ذوق کی محاورہ بندی سے لگاؤ ہے، نہ غالب کی دوراز کار مضمون آفرینی سے''۔ (ص ۴۴۲۔۴۴۳)

یوں تو اس کتاب کا ہر باب اہم ہے اور اپنی انفرادی خصوصیت رکھتا ہے لیکن کلام مومن کی تفہیم کے نقطۂ نظر سے وہ حصہ خاص طور پر مفید ہے جو کتاب کے آخر میں ضمیمہ ۲ کی حیثیت سے شامل ہے۔ اس میں ایسے الفاظ، محاورات اور تراکیب کی فہرست دی گئی ہے جو مومن سے مخصوص ہیں یا جنہیں انہوں نے اپنے منفرد انداز سے استعمال کر کے ان کے مفاہیم میں توسیع اور معنویت میں اضافہ کیا ہے۔ یہ ایک نئے انداز کا کام ہے۔ اس نہج پر مومن کے سلسلہ میں اب تک کسی نے کام نہیں کیا۔ ان الفاظ اور محاورات کے ساتھ وہ مصرعے بھی دئے گئے ہیں جن میں یہ وارد ہوئے ہیں۔ اس کے ساتھ اگر ان کے معانی و مطالب بھی بیان کر دئے جاتے تو ان سے مومن کے کلام کو سمجھنے میں بے حد مدد ملتی۔

مجموعی طور پر یہ کتاب انتہائی مفید ہے اور مومن شناسی میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ جو حضرات اس کا بالاستیعاب مطالعہ کریں گے انہیں پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کی اس رائے سے اتفاق کرنے میں ذرا بھی تامل نہ ہوگا:

''صدیقی صاحب نے مستند مآخذ کی مدد سے مومن اور عہد مومن کا ایک مرقع پیش کیا ہے اور ادبی تاریخ میں ان کا صحیح مقام متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا ذوق ادب نہایت شستہ اور تربیت یافتہ ہے۔ ان کی تنقید میں ایک خاص قسم کی شرافت ہے جو ان کو جادۂ صواب سے ہٹنے نہیں دیتی۔ ان کی تحقیق میں ایک خاص بے لوثی ہے جو انہیں مجبور کرتی ہے کہ ایک ایک مآخذ کو پرکھیں اور اس کے بعد اس مواد کو ایک لڑی میں پروئیں۔ ان کا اسلوب بھی شگفتہ ہے اور ان کا لب ولہجہ بھی سنجیدہ۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اس قدر دلکش کے ساتھ گلزار میں آئے ہیں اور انہوں نے اس نقش کی درستگی میں اتنی محنت کی ہے کہ ان کی یہ تحقیق مطالعۂ مومن میں ایک خاص امتیاز رکھتی ہے۔''

مومن شناسی کے سلسلہ میں ظہیر صاحب کا دوسرا اہم کام انشائے مومن کی اشاعت جدید ہے۔ یہ اصلاً مومن کی فارسی نثر کا مجموعہ ہے۔ اسے پہلی بار مومن کے حبیب صادق حکیم احسن اللہ خاں نے ترتیب دے کر ۱۲۷۱ھ میں مطبع سلطانی دہلی میں طبع کرا کے شایع کیا تھا۔ اس مطبوعہ ایڈیشن کے علاوہ اس کے کچھ قلمی نسخے بھی ملتے ہیں۔ ظہیر صاحب نے اس مطبوعہ ایڈیشن کا دستیاب قلمی نسخوں سے مقابلہ کر کے ایک مستند متن تیار کیا اور اردو ترجمہ کے ساتھ اسے غالب اکیڈمی دہلی سے شایع کرایا۔ اس کے مشمولات میں ۱۳۰ خطوط چند تقاریظ خطبات اور دیباچے ہیں۔ یہاں بھی مومن کی مشکل پسند طبیعت نے خوب گل کھلائے ہیں۔ کہیں ظہوری کا رنگ اختیار کیا ہے تو کہیں نعمت خان عالی کا۔ نئی نئی تراکیب، دور از فہم استعارے لفظی مناسبات طول کلامی، مبالغہ آرائی، طب اور نجوم کی نامانوس اصطلاحیں اور قرآن کریم کی آیات کا کثرت سے استعمال، نتیجتاً

ان کی تحریریں مشکل سے مشکل تر مغلق اور عام ذہنی سطح سے بالاتر ہوتی چلی گئی ہیں۔ان کا سمجھنا اور ان کی رنگینی و ندرت خیال سے لطف اندوز ہونا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ظہیر صاحب نے اردو داں طبقہ اور مومن کے پرستاروں پر یہ زبردست احسان کیا کہ متن کے ساتھ ان فارسی تحریروں کا اردو ترجمہ بھی شایع کر دیا ہے۔اس سے فارسی زبان پر ان کی غیر معمولی قدرت کا پتہ بھی چلتا ہے۔اس طرح پروفیسر ضیاء احمد بدایونی نے شرح قصاید مومن اور شرح دیوان مومن لکھ کر مومن شناسی کا جو سلسلہ شروع کیا تھا ظہیر صاحب نے نہ صرف اسے جاری رکھا، بلکہ اس میں اہم کڑیوں کا اضافہ بھی کیا جس کے لئے وہ ہم سب کے شکریہ کے مستحق ہیں۔

☆☆☆

پروفیسر عتیق احمد صدیقی
شعبہ اردو، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

دیوان درد (مرتبہ ظہیر احمد صدیقی) پر ایک نظر

ادعائیت ان کے مزاج سے کوسوں دور تھی اور انکسار و فروتنی ان کا شیوہ و شعار! وہ شاعری بھی کرتے رہے اور نثر نگاری بھی، وہ محقق بھی تھے اور نقاد بھی۔ وہ ایک عرصہ تک پرورش لوح و قلم کرتے رہے اور ان کے رشحات قلم سے متنوع تحریریں وجود میں آئیں۔ پروفیسر ظہیر احمد صدیقی جن کا علمی و تعلیمی سفر بیسویں صدی کے وسط میں شروع ہوا تو آخر عمر تک جاری رہا۔ درس و تدریس ساری عمر ان کا مشغلہ رہا جس میں وہ ذوق شوق کے ساتھ منہمک رہے اور اپنے شاگردوں کے لئے مثالی نمونہ قائم کیا۔ وہ مشاعروں، سیمناروں اور دیگر علمی مجلسوں میں برابر شریک ہوتے رہے اور اپنی علمی کاوشوں کو پیش کرتے رہے۔ ان کی تحریریں علمی جرائد و رسائل کی زینت بنتی رہیں۔ انکے بہت سے مبسوط کام کتابی شکل میں منصۂ شہود پر آئے اور علمی دنیا سے اپنا اعتراف کرایا۔ ان میں سے ہر ایک اس بات کا مقتضی ہے کہ اس کا بھرپور جائزہ لیا جائے، لیکن اس مختصر تحریر میں اس کی گنجائش نہیں۔ اس لیئے ان کے ایک تدوینی کام ''دیوان درد'' کے تعارف پر اکتفا کیا جائے گا۔

''دیوان درد'' کا ۱۹۶۳ء کا شائع شدہ نسخہ پیش نظر ہے جسے مکتبہ جامعہ نے

شائع کیا۔ اردو شاعری کا آغاز شمالی ہند میں اٹھارویں صدی میں ہوا۔ لیکن اس صدی کے ختم ہونے سے پہلے پہلے ایسے نامور شعرا سامنے آئے جن کے آفتاب شاعری سے ادبی افق جگمگا اٹھا اور یہ جگمگاہٹ ایسی لازوال ہوئی کہ آج تک اس دور کو اردو شاعری کا ''زریں دور'' کہا جاتا ہے۔ درد بھی اس دور کے ممتاز شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ دوگونہ امتیاز کے حامل ہیں۔ ایک طرف ان کی خانقاہی زندگی ہے جس کا ماحصل ان کی روحانیت انکاورع وتقوی، ان کی جامع شریعت وطریقت شخصیت اور ان کی خدا پرستی تھی تو دوسری طرف ان کا عالمانہ اور شاعرانہ منصب ہے جس کا اعتراف اس دور میں بھی کیا گیا اور وہ میر ومرزا کی صف کے شاعر قرار پائے اور آج بھی ان کی یہ حیثیت قائم ہے۔ بجا طور پر دردؔ کی شاعری کی طرف توجہ دی گئی۔ لیکن ہر مطالعہ کے لیے ضروری ہے کہ شاعر کا مستند متن فراہم ہو۔ اگر چہ دیوان دردؔ کے بہت سے قلمی اور مطبوعہ نسخے اس تدوین سے پیشتر دستیاب تھے، جن میں نواب صدر یار جنگ حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کی نگرانی میں مرتب شدہ دیوان بھی شامل تھا جو کافی احتیاط واہتمام سے شائع کیا گیا تھا۔ لیکن مدون کو پھر بھی یہ تشنگی محسوس ہوئی کہ ''درد کا کلام جدید متن نگاری کے اصول پر ترتیب'' نہیں دیا گیا۔ اب کہ تحقیق نے تدوین متن کے بعض اصول مرتب کر دیئے تھے، اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی کہ متون کو ان کی روشنی میں ترتیب دیا جائے تا کہ متن کی صحت سے قریب تر شکلیں متعین ہو جائیں۔

فاضل مدون نے مندرجہ ذیل امور کو اصولی طور پر مدنظر رکھ کر یہ کارنامہ انجام دیا:

۱. متن مین شعر کی صحیح اور مرجح شکل پیش کی جائے۔

۲. دوسری شکلیں حاشیہ میں حوالوں کے ساتھ پیش کر دی جائیں۔

۳. بنیادی طور پر متن کے تعین کے لیئے ایک اساسی نسخہ (مخطوط ۱۲۲۲ھ) کے متن کو ترجیح دی گئی۔

۴. لیکن اگر اس نسخہ میں سہو کاتب سے کوئی شعر ناموزوں ہو گیا ہے تو دوسرے نسخوں میں صحیح شکل کو مرجح و مختار قرار دیا گیا۔

۵. دوسرے نسخوں کے زائد اشعار کو شامل متن کر لیا گیا۔

۶. فردیات کو غزلوں سے علیحدہ آخر میں درج کیا گیا۔

۷. رباعی اور قطعہ کے بنیادی فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کو الگ الگ درج کیا گیا۔

۸. چھ قلمی اور مطبوعہ نسخوں سے موازنہ و مقابلہ کرنے کے علاوہ مختلف تذکروں میں مندرج اشعار سے بھی موازنہ کیا گیا۔

اٹھارویں صدی کی تحریروں کی تدوین میں ایک مسئلہ املا و رسم خط کا بھی ابھرتا ہے۔ بہت سے الفاظ کے املا میں تبدیلی ہو گئی ہے، بعض الفاظ کا تلفظ بھی بدلا ہے یا بعض الفاظ کو ضرورت شعری کی وجہ سے اشباع و تخفیف کے ساتھ استعمال کرنے کو روا رکھا جاتا تھا۔ ایسے تمام الفاظ کے املا میں مدون کو بطور خاص احتیاط برتنی پڑی ہے۔ مدون نے ان مسائل پر قابو پانے کے لیئے چند باتوں کو ملحوظ رکھا ہے:

۱. وزن شعر کا خیال رکھتے ہوئے جہاں تک ممکن ہوا جدید املا کی پیروی کی گئی۔

۲. ''نیں'' (نے) کو جدید املا کے مطابق ''نے'' میں بدل دیا گیا ہے، لیکن ردیف و قافیہ میں اس کا استعمال ہوا تو ''نیں'' ہی کو برقرار رکھا گیا۔

ان رہ نما خطوط کو مدنظر رکھتے ہوئے متن کو مدون کیا گیا ہے۔ اسے مستند و معتبر متن قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن متن کے ساتھ انہوں نے ایک مبسوط مقدمہ بھی لکھا ہے،

جس میں نہ صرف دردؔ کی شاعری کا جائزہ لیا گیا ہے، بلکہ اور بھی بہت سے موضوعات زیر بحث آئے۔ جن سے دردؔ کی شاعری کی تفہیم میں مدد ملتی ہے۔ یہ مباحث صاحب تدوین کی ژرف نگاہی اور گہری علمیت کا مظہر ہیں۔ ان کو درج ذیل عنوانات میں تقسیم کیا گیا:

۱. تصوف

۲. دردؔ کی شخصیت

۳. طریقہ محمدیہ

۴. شاعری

تصوف کو خاص طور پر زیر بحث لانے کا جواز اس حقیقت میں ہے کہ یہ محض ایک انفرادی ذہنی واردات نہیں تھی، بلکہ اس کا گہرا تعلق پورے فکری نظام اور عملی زندگی سے تھا۔ تصوف نے صرف افراد کو ہی متاثر نہیں کیا تھا بلکہ پورا معاشرہ اس سے متاثر تھا۔ اٹھارویں صدی میں جو انقلابات رونما ہوئے اور سیاسی نظام میں ابتری پیدا ہوئی اور تباہی و بربادی کے قیامت خیز واقعات پیش آئے، ان سب کے مجموعی اثر سے تصوف کے نظریات کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ دنیا کی بے ثباتی، اسباب ظاہری کی بے اعتباری، مادی وسائل کی ناپائیداری، جو تصوف کی تعلیمات کی بنیاد تھیں، خارجی حالات نے ان کو پایۂ ثبوت تک پہنچا دیا تھا۔ تصوف کے نظریات کے حامل اشخاص و افراد کے علاوہ عوام کے ذہن بھی بڑے پیمانے پر ان تصورات سے متاثر ہوئے تھے۔ پوری معاشرتی زندگی انہیں کے سانچے میں ڈھل رہی تھی، شعر و ادب بھی انہیں کے سایہ میں پروان چڑھ رہے تھے۔ دردؔ شاعر بھی تھے اور تصوف سے عملاً وابستہ بھی۔ تصوف انکی شاعری میں روح کی طرح کارفرما تھا۔ عشق الٰہی جو تصوف کی اساس ہے وہ شاعری کا سرچشمہ بھی بن گیا اور شاعری میں حقیقت و مجاز ایک دوسرے میں ضم ہو گئے۔ دردؔ کی شاعری میں بھی یہ رنگ

جگمگاتے نظر آتے ہیں۔ اگر چہ حقیقت کا رنگ غالب ہے۔ اس لیے درد کی شاعری کی تفہیم کے لیے تصوف کے بنیادی نظریات کی تفہیم ضروری ہے۔ فاضل مقدمہ نگار نے اسی لیے تصوف کی بحث کو بطور خاص اٹھایا اور بعض تصورات کو تشریح و توضیح کے ذریعہ عام فہم انداز میں پیش کیا۔ ان سوالات کا جواب دینے کی کوشش کی کہ تصوف کیا ہے؟ خود لفظ تصوف کی اصل کیا ہے، کیا تصوف (طریقت) اور شریعت میں کوئی تضاد ہے؟ وحدت الوجود وحدت الشہود کے نظریات سے کیا مطلب ہے اور کیا یہ ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں؟ یہ اور اس طرح کے بہت سے تصورات درد کی شاعری میں گھل مل کر دلکش مرقع کی شکل میں ابھرے ہیں۔ ان تصورات سے واقفیت کے بغیر درد کی شاعری کی معنوی گہرائی تک پہنچنا مشکل ہوتا ہے۔ ان مباحث میں ایسے اقوال کافی اہمیت کے حامل ہیں:

''تصوف وجدان، کشف یا حس باطن کے ذریعہ سے حقیقت کو دریافت کرنے کا دوسرا نام ہے''

''تصوف کے تمام سلسلے اور تمام شاخیں حق تعالیٰ سے شروع ہو کر اسی پر ختم ہو جاتی ہیں۔ صوفیہ کے یہاں دوئی کی گنجائش نہیں ہے کیونکہ ان کا بیان ہے کہ ہمارے کشف کے نتائج تمام کائنات کی ایک اصل یا حقیقت الحقائق کا اثبات کرتے ہیں''۔

''دردؔ کے یہاں مذہب تصوف سے اور تصوف مذہب سے کچھ جدا چیز نہیں ہے۔''

اس آخر الذکر تصور کی کچھ مزید تصریح ''طریقۂ محمدیہ'' کے ذیل میں کی گئی ہے۔ دردؔ کے والد جو خود ایک برگزیدہ صوفی تھے، امام حسنؒ کے روحانی فیضان سے بہرہ ور ہوئے اور ''طریقہ محمدیہ'' کی بنیاد ڈالی، جس کی تفصیل دردؔ نے اپنی مشہور تصنیف ''علم الکتاب'' میں پیش کی ہے اور امام عالی مقام کا یہ القائی قول نقل کیا ہے: